کھڑکی بھر آسمان
نظمیں، کہانیاں
اسد محمد خاں

•••••

میرے پاس ایک کشتی ہے
جو پانی کی آواز اور لمس سے اجنبی ہے
اور ایک درخت جو ہوا اور آگ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا

•••••

میرے پاس دوستوں کو دینے کے لیے
بہت سے تحفے اور ایک محبت بھرا دل موجود ہے
اور دشمنوں کے لیے ایک تلوار
جس کی پیاس کبھی نہیں بجھتی

(ہمعصر شاعر ذی شان ساحل کی نظم 'ایرینا' سے اقتباس)

اسد محمد خاں

سی-۱۴ شہر بانو پلازا ایف بی ایریا- کراچی ۳۸

۲۰۰ صفحات

مُشورت
ساقی فاروقی
جون ایلیا
شکیل عادل زادہ
انور شعور

سرورق، خطاطی عبدالرشید شاہد
مَطبع ابنِ حسن پریس۔ کراچی
ناشر سیفورٹین
سی۔۱۴
شہر بانو پلازا
ایف بی ایریا
کراچی

پچیس روپے

نظمیں

کہانیاں

ادب صرف اپنے آمروں کو پہچانتا ہے اور میں بڑی بے شرمی کے ساتھ اعتراف کرتا ہوں کہ میں بھی اپنی ایک چھوٹی سی قلمرو تراش کر اُس کی طے شدہ حدوں میں اپنا حکم نافذ کرنے آیا ہوں۔

مجھے بہ حفاظت کسی کارواں سَرا تک نہیں پہنچنا کہ میں تو خدا اتنی پُرانی اور اَن چارٹرڈ زمینوں سے ہوتا ہوا کسی نامعلوم تک جانا چاہتا ہوں اور ایک وشتِ محال کے تمام بھیڑیوں کا خطرہ مول لینے کو تیار ہوں۔

اِن باتوں سے ہرگز یہ نہ سمجھا جائے کہ میں کسی قسم کا کوئی جھنڈا اُٹھائے چل پڑا ہوں یا کوئی عندلیبِ گلشن ناآفریدہ ہوں یا کوئی محمد تغلق ہوں جو اپنے وقت سے پہلے پیدا ہو گیا ہے یا کوئی بہت مظلوم اور غضب ناک لیکھک ہوں۔ جی نہیں۔ میں تو ٹھنڈی پھوہار میں گاتا ہوا چلا تھا۔ گاتے رہنا چاہتا ہوں کہ باہر کوئی ساون رہے نہ رہے میں اپنی رُتوں میں بھیگتے رہنے اور شرابور کر دینے کا ہوس مند ہوں۔

میں تو گھاس کا چھوٹا سا اک فرعون ہوں اور اپنے تنکوں سے ایک ورقِ سادہ پر مائکرو اسکوپک لکیریں بناتا جا رہا ہوں۔ اگر آپ اِن لکیروں کو پڑھ لیں گے تو اپنے اور میرے حق میں دُعائے مغفرت کریں گے۔ اگر نہیں تو آپ کو میری موجودگی کا پتا بھی نہیں چلے گا اور میں اپنی راہ چلا جاؤں گا۔ اس طرح ایک شریفانہ باہمی بے تعلقی ہم دونوں کی نجاتِ اُخروی کی ضمانت ہو گی۔

نہ میں کسی تحریک کا بانی بن سکتا ہوں، نہ بننا چاہتا ہوں۔ میں کسی تحریک کا پُرجوش حامی اور مخلص پیرو کار بننے کے صبر آزما کام سے جی چرانے والا آدمی ہوں۔

ایک غیر حقیقی معاشی زندگی میں تو میں سفید کالر والا غلام ہوں مگر اُس سرگرمی میں کہ جسے میں ادبی سرگرمی سمجھتا ہوں مجھے سفید کالر والا غلام بننا منظور نہیں

ایک اور بات، کہ میں نے یہ چند سطریں آنے والوں کے لیے نہیں لکھیں، یہ آپ کے لیے ہیں کیونکہ مجھے شُبہ ہے کہ آپ میں اور مجھ میں ابھی زندگی کی ایک رمق باقی ہے۔ کوئی نسلِ آئندہ میری مخاطب نہیں۔ کیا پتا وہ کون لوگ ہوں، کیسے ہوں۔ کیا خبر اُن کا مسئلہ صرف معاشں، محض انٹرٹینمنٹ کا حصُول ہو۔ اور اگر وہ نامعلوم لوگ اتنے دہشتناک نہ بھی ہوئے تو کیا ضمانت کہ میرے لکھے کچے پکّے لفظ اتنے دن چل بھی جائیں۔

میں تو بس اپنے زمانے کے اُن تمام نک چڑھے، پیارے اور مشکل لوگوں کو شکار کرنا چاہتا ہوں جو ہر عہد میں شکار کیے جانے کے لائق ہوتے ہیں، اب اگر میں اُن کے معیار پر پورا نہیں اترتا تو یہ میری ہلاکت ہے۔ ان پیارے نک چڑھے مشکل لوگوں پر اس کی ذمہ داری عائد نہیں ہوگی۔ خود میں دو ٹکے کا آدمی نکلوں گا۔ تاہم میرے یہاں یہ خوش فہمی موجود رہے گی کہ وہ آسانی سے شکار نہ ہونے والے لوگ شاید کبھی توجہ کریں گے اور شاید ایک بار کہیں گے کہ "یہ بھی ڈھونڈنے والوں میں شامل تھا" اور اگر ایسا نہ بھی ہوا تو کیا یہ کوشش اپنی اُجرت آپ نہیں ہے؟

یہ بہت سادہ اور کم لاگت سے تیار کی ہوئی کتاب ہے۔ میں اس بات کو سمجھتا ہوں کہ چاہے اپنا مجموعہ ورقِ طلائی پر خطِ گہر بار سے لکھوا کر پیش کروں، چاہے

کچّے اخباری کاغذ پر توپ دوں۔ میں رہوں گا وہی جو کہ میں ہوں۔ اس لیے میں یہ نہیں چاہتا کہ میرے اپنے لفظوں کی بجائے کتابت اور طباعت اور جلد سازی کی معزز صنعتیں میری نمائندگی کریں۔

میں اپنی اس کتاب کو کہ جسے میں اپنی پہلی ایکسٹرا سائز بک سمجھتا ہوں، بڑے انکسار اور کمال رعونت کے ساتھ خود چھاپ کر اپنے گھر سے شائع کر رہا ہوں۔ مجھے یہ گمان ہے کہ میں اچھا خاصا لکھنے والا ہوں مگر اتنا اچھّا تجارتی جُوا نہیں ہوں تو پھر اپنے اوپر پندرہ بیس ہزار رُوپے کیوں لگاؤں۔ اتنے پیسوں سے تو بہت سے اور نیکی کے کام کیے جاسکتے ہیں۔

جنوری ۱۹۸۲ء

اَسد محمّد خاں

سی۔۱۴ شہر بانو پلازا

ایف بی ایریا۔ کراچی ۳۸

سَچے لفظ کہاں چھوڑ آئے
کیا کرتے مَیں جیب نہیں تھی؟

وِندھیاچل کی آتما

میں وندھیاچل کی آتما
مرے ماتھے چندن چندرما
مری مانگ سانجھ کی دھوپ
میں چِترکار کا اَنتِم چِتر
کلا کا اُتّم رُوپ

مری دھارا کے سب رُوپ جال
کہیں نربدیا کہیں کمل تال
میں بچھڑوں کا سنجوگ
تری رُوپ مَتی کا سُکھ سَپنا
ستی کمل پتی کا سوگ

مرے کیکر سب ترے گھاؤ رِشیں
مرے پیپل دکھ کی دھوپ سہیں
ترے گھایل مَن کو بچائیں
مرے مور پنکھ مرے مِرگ نین
تری سُونی سبھا سجائیں

۱۹۶۲ء

رات اور سیتا

اندھیارے کی کالی مَیّا مَن کو پھاڑے کھائیں
شمشانوں کے باگھ ڈکاریں اندھے کنوئیں بُلائیں
پگڈنڈی کے شیش ناگجی پگ پگ ڈستے جائیں
پیڑ۔ راکھشس، بادل۔ راون، گھر۔ بھتنے بنجائیں

دھیان کے اِندر پتّھ پلے ہتی گھڑیاں اُڑتی آئیں

میں سیتا بن باس کو نکلی بِرہ کی اگنی جلائے
آگے آگے رامجیؔ ناہیں، پیچھے لچھمنؔ نائے

۶۶۲

درشن

'انوکھا لاڈلا کھیلن کو مانگے چاند'
کیسی انوکھی بات رے

تن کے گھاؤ تو بھر گئے داتا
من کا گھاؤ نہیں بھر پاتا

جی کا حال سمجھ نہیں آتا
کیسی انوکھی بات رے

'انوکھا لاڈلا کھیلن کو مانگے چاند'

پیاس نہ بجھے کب اِک درشن میں
تن سُلگے بس ایک لگن میں

من بولے رکھ لوُں نینن میں
کیسی انوکھی بات رے

اُنوکھا لاڈلا کھیلن کو مانگے چاند

۱۹۶۲ء

لاحاصل

جانتا ہُوں کہ ہم تم بچھڑ جائیں گے
جانتا ہُوں کہ دونوں مِلے بھی کہاں
رات، لیکن
مرے آسماں!
میں نے دیکھا
مری آرزو کا سمندر تجھے چھُو رہا تھا

۱۹۶۴ء

سُورج ساگر

ترے منظر پر کوئی چاند ابھرے
کچھ کہتا رہے تری لہروں سے
تو چاند کی چاہت میں پھولے۔
میں جلتا رہوں بس تیرے لیے
مجھے کیا لینا، مجھے کیا کہنا
مرے ساگر، میں وہ سورج ہوں
جو آگ شفق سب طے کرتا
بالآخر تجھ میں ڈوب چلا

۶۴ء

سایہ سایہ

یہ بادل ——— وہ برگد ہے
اور برگد بہت بڑا ہے
باہر دھوپ وہی ہے اب تک ......
اب تک وہی ہوا ہے۔
اس بادل کے سائے سائے
کتنی دیر رہو گے
آخر دھوپ سہو گے
ہوا چلے، بادل چھٹ جائے دُکھ نہ اُٹھانا
بس لوٹ آنا
برگد قدم جمائے کھڑا ہے
برگد بہت بڑا ہے

۶۶۴ء

حاسد

ایک دن
چاندنی کے سحر میں
ریت پر اپنا جنوں تحریر کرنے آؤں گا
دوسرے سب خواب، ساری چاہتیں، سارے نشاں
میں سمندر ہوں
بہا لے جاؤں گا۔

۱۹۶۴ء

آدھی رات کا سُورج

کسی چوکھٹ پہ چوکیدار لاٹھی کھٹکھٹاتا ہے
وہ کھڑکی کھُل گئی
اک ریلوے انجن، تھکی ہاری بسیں، کچھ بحث کُتّے،
اُلجھنیں، محمُود میاں
لو پھر قطار اندر قطار آئیں
وہ کھڑکی کھل گئی
پھر موت دَرّاتی چلی آئی

○

تمہارے صحن میں کیلے کے پتّے جانکنی میں سر پٹکتے ہیں
سنا؟ پھر بلّیاں اُس ٹین کی چھت پر
ہراساں پھر رہی ہیں

صبح کی پہلی کرن کے جاگنے تک
موت، ہر ذی روح کو
بے روح کو
ڈستی رہے گی
صبح تک ڈستی چلی جائے گی .....
لیکن وقت کے اِس بے اماں گوشے میں
تم زندہ رہو گے۔
تم جو کل تک موت کی تاریک راتوں میں رہے
اس رات اک سورج کے مالک ہو
کسی نے اس دریدہ آستیں پر آج
اک آنسو سجایا ہے۔

۶۲ء

نومنزلہ بلڈنگ

زمیں کا رقصِ پیہم، زمہریری کہر، زنجیرِ کشش، شانے
اور اک نومنزلہ بلڈنگ
اور اس نومنزلہ بلڈنگ کو ان ناتواں شانوں کی
باقی ماندہ قوّت سے سہارے
اس فسردہ شہر کی سب سے بڑی فٹ پاتھ پر
ٹانگیں پسارے
ہر گزرتے واہمے کو تکنے والا ——— میں

خداوندا! یہ برفیلی ہوا تھی یا کوئی لمحہ
صبا رفتار لمحہ، برق دَم لمحہ - جو میری انگلیوں کے
درمیاں سے خواب کی مانند گزرا
کیا مُرورِ وقت جاری ہے؟

مرے لاغر بدن میں کون ناخن گاڑتا ہے
کیوں زمیں یخ بستہ زنبوروں میں میرے پاؤں
جکڑے لے رہی ہے
کون ہوں میں ؟ کون ہوں ؟ اور نام ؟
میرا نام کیا ہے ؟
کیا میں زندہ ہوں ؟

میں زندہ ہوں ! میں زندہ ہوں !!
میں اپنی چیخ سُن سکتا ہوں
اک پَل کے لیے ٹھہرو
بس اک پَل کے لیے ٹھہرو
کہ اپنے ناتواں شانوں کو اس نو منزلہ بلڈنگ سے
آزاد تو کر لوں

میں کہتا ہوں ..... میں سُنتا ہوں

مرے اطراف میری ہی صدا کے نیم جاں سائے
عذابِ جانکنی میں رقص کرتے ہیں

مگر وہ گربہ پا لمحہ ہوا کے دوش پر اُڑتا چلا جاتا ہے .....
یہ نو منزلہ بلڈنگ !

خداوندا — میں تنہا ہوں ، میں تنہا ہوں
مری جانب بڑے بے رحم سنّاٹوں میں لپٹی شام بڑھتی آ رہی ہے
میں گرا جاتا ہوں
بولو — کیا میں لمحوں کی اَبابیلیں اپنی مٹھّی میں جکڑ لوں ؟
کیا میں اِس نو منزلہ بلڈنگ کو اِن ناتواں شانوں سے نیچے پھینک دوں؟
اٹھ کر کھڑا ہو جاؤں ؟
مگر میں نے تو — اس نو منزلہ بلڈنگ کی خاطر ——
خود اپنے ناخنوں سے نیو کھودی تھی ۔
۶۲ء

ایمن کا خیال

یہ ترا چہرہ
سلونا سانولا چہرہ
یہ چہرہ جیسے ایمن کا خیال
رات کا پچھلا پہر
یا نرم مٹّی کی مہک
یا عہدِ ماضی کا جمال
اَن گنت سرگوشیوں کی بازگشت
اُن زمانوں کا نشاں
جب میں نہ تھا
اُن زمانوں کا نشاں
جب تو نہ تھا

۱۹۶۷ء

قرض

اک عدن جل رہا تھا — نگہباں خدا
اُس گھڑی ساتویں آسماں پر نہ تھا
اور ازل سے اَبد تک احاطہ کیے
ایک اَفعی کی منحوس آواز تھی

اور خُدا میرے شام وسحر میں نہ تھا
میرے گھر میں نہ تھا

اور خُدا ؟
جو دبے پاؤں کھڑکی سے پیچھے ہٹا
جو مرے ساتھ سُونی سڑک پر رُکا
یک بیک منفعِل ہچکیوں میں بکھرنے لگا
اک جلالِ رواں میرے ہمراہ گلیوں میں چلنے لگا

اور خجالت کی یہ رات
اک سرد پتھّر پہ تکیہ کیے
میری بانہوں میں بانہیں دیے
میرے معبود نے
قہرماں کرب میں کاٹ دی
اور عدن جل بجھا

ذوالجلال آنسوؤں کے طفیل آج بھی
ہر نفس اک سُلگتا ہوا قرض ہے
اک نیا گھر مقدّس گھروں کی قسم
میرے معبُود پر آج بھی قرض ہے

۱۹۶۳ء

آنکھوں کا جھُوٹ

سپنا ہو گا
سایہ ہو گا
پل بھر کے لیے جو آیا تھا
یا نیند بھری اُن آنکھوں نے آنکھوں سے جھوٹ کہا ہو گا

○

وہ اُجلے درپن کی مورت
جو چیتر بھَون میں گھُوم رہی
انجانے سپنے کی صورت
ہر سمئے نئی پہچان لیے

وہ ایک صدی
میں ایک پلک
میں ایک جنم!
کانٹوں کی چِتا میں جَلتا بَلتا ایک جنم
وہ بے شمار
میں ایک بار
میں ایک بار جل بجُھا اگر تو کیا ہو گا

○

پَل بھر کے لیے جو آیا تھا
بیتی رُت کا جھونکا ہو گا
یا نیند بھری اُن آنکھوں نے
آنکھوں سے جھوٹ کہا ہو گا

۶۷۰

سُورج کے جلتے وہار میں

سورج کے جلتے وِہار میں
بس گئی
بسنتی رنگ بھری بدری
کہ بدری برس گئی
اک رُت کی

جلتی بہار میں
کایا کی سرسوں جھلس گئی
اور جھُوم جھُوم کے ناچ رہی دھرتی
کہ بدری برس گئی

یہی ناچ امر، یہی کھیل امر
کیا گئے دنوں کا پچھتاوا
کیا نئی رُتوں کا بہلاوا

○

نینوں کی جوت جگائے رکھو
کس روز بہار بسنت نہیں
اس پاگل رُت کا اَنت نہیں
کوئی اَنت نہیں

۷۰ء

ایک عبادت کا گیت

ہیلّے لُویاہ ! ہیلّے لُویاہ !!
میں بڑی قدرت و شان والا ہوں
کہ نیم قد بوزنوں کے درمیان سے گزرتا ہوں
تو اپنے قامت کا اثبات کرتا ہوں
اور زمین پر اینڈتا ہوا چلتا ہوں
اور زمین پر بڑی دھمک سے میرے قدم پڑتے ہیں
(تو میں ایسا ، اور ایسا اور ایسا کیوں نہ کروں ؟)

ہیلّے لویاہ! ہیلّے لُویاہ!!

میں بڑی قدرت و شان والا ہوں

کہ نیم قد بوزنوں کو تو موت نے آلیا

اور وہ ختم ہوئے تو بس ختم ہی ہو گئے

پر میں، لفظ میں

اور احساس میں

اور جذبے میں سانس لیتا اور کلام کرتا ہوں

کہ بڑی قدرت و شان والا ہوں ——

(تو میں ایسا، اور ایسا، اور ایسا کیوں نہ کروں؟)

ہیلّے لُویاہ! ہیلّے لویاہ!!

۱۹۷۴ء

تین مختصر آڈیو وِژوَل نوحے

سہ پہر کا نوحہ

آڈیو: دن مَرتا جا رہا ہے
پہ خدُا مہربان ہے
روشندان کھلا ہے
اور ماسٹر تربینی چرَن ابھی زندہ ہیں۔

وِژوَل: (کلاس رُوم میں تین سمتوں سے روشنیاں آ رہی ہیں)

شام کا نوحہ

آڈیو: شام نے ہمیں آلیا
اور شام نے روشندان بجُھا دیا
اور ہم نے خدا اور ماسٹر تربینی چرَن کو
چھُٹی دے دی

اب ہم
بلیک بورڈ کے نیچے
ٹرمپٹ کی پکُاریں

"او کیل کتا" کر رہے ہیں۔

وِڑول: (تاریکی پھیل رہی ہے۔ وِڑول پوری طرح کام نہیں کر رہا)

رات کا نوحہ

آڈیو: او کیل کتا

او کیل کتا

او او او کیل کتا۔

وِڑول: مکمل تاریکی ہے۔ وِڑول کام نہیں کر رہا)

آڈیو: او او او او

نوٹ : گمان غالب ہے کہ

خدا اور روشنی اور ماسٹر تربینی چرن

باہر تاریکی میں کہیں موجود ہیں

اور ہمارے خلاف "او کیل کتا" کر رہے ہیں کہ

او او او

او کیل کتا۔

۱۹۷۱-۷۳ء

تانڈو نرِتّ

وہ آ رہا تھا
وہ اپنا سانپ کس کمر سے باندھے
علامتوں اور بشارتوں اور ہندسوں کی
ہزار خود کار سیڑھیوں سے اُتر رہا تھا
وہ آنسوؤں اور اُداس روحوں کے گیت گا رہا تھا
وہ آ رہا تھا۔

جو ہم نے چہرے اُٹھا کے دیکھا
کہ اُس کا چہرہ ہمارے سورج کی طرح روشن
اور اُس کی آواز اپنے سمندروں سے گہری
اور اُس کی پہچان اپنی پہچان سے قوی ہے
تو ہم نے اپنے دِلوں میں سوچا کہ یہ وہی ہے

اور ہم نے اپنے دِلوں میں سوچا کہ یہ مہا پُرش ہے
مکمّل ہے
اور بہتر ہے
ہم نے اَب تک یہی سُنا تھا
کہ جو مہا پُرش ہے، مکمّل ہے اور بہتر ہے
وہ ازل سے بلندیوں پر قیام کرتا ہے ——
ہم نے سوچا
وہ آگیا ہے تو اپنی پہچان اُس کی پہچان سے مِلا دیں۔
مگر وہ ہر بات جانتا تھا
(کہ وہ مہا پُرش تھا، مکمّل تھا اور بہتر تھا —— ہر بات جانتا تھا)
سو اُس نے دو انگلیاں اٹھائیں
اور اپنی بے تاب انگلیوں سے
ہزار ہا فحش علامتیں بنائیں ......
پھر اُس نے اپنے سفید ہاتھوں کو آسماں کی طرف بڑھایا
ہمیں دُعا دی .....
ہمیں دُعا دی کہ ہم خوشی کا سُراغ پالیں

ہمیں دُعا دی کہ بیسواؤں کے بستروں پر
ہمارے ملبوس گندگی سے بچے رہیں
ہمیں دُعا دی، کہ ہم اَبد تک یہ جاننے کا عذاب جھیلیں
کہ ہم نہیں ہیں۔

ابھی ہم اس کی دُعا کی آواز اپنے چہروں پہ مَل رہے تھے
جو اُس نے ہم سے کہا
کہ ــــ" لوگو ــــ
" میں اپنے ہونے سے تھک گیا ہوں
" اور اس حقیقت کے جاننے سے کہ میں رہوں گا
" اور اس حقیقت کے جاننے سے کہ میں رہا ہوں
" اور اپنے ہونے سے، ہوتے رہنے سے
" تھک گیا ہوں!
" اِس اپنے ہونے سے تھک گیا ہوں!"
اور آنے والے نے
اس مہاپرش
اُس مکمّل نے اور بہتر نے اپنا فے لَس اُتار پھینکا
تو ہم نے دیکھا

کہ یہ زمین
جس کو ہمارے پُرکھوں نے اپنی مُنافقت میں
(ہمارے بچّوں کے واسطے یا ہماری خاطر)
ہَرے بھَرے مَرغزاروں سے ڈھک دیا تھا
چٹخ رہی ہے
غلیظ پانی بھرے مثانے کی طرح سے بیٹھنے لگی ہے

۱۹۷۱ء

اَلبِیٹراس

میں تو یہ بھی چاہتا تھا کہ شام کو گھر لوٹوں
تو نرم روٹیوں کی آسائشیں میری جیب میں ہوں
مگر یاروں نے غضب کیا
کہ میری گردن میں زندہ اَلبِیٹراس لٹکا دی

میں اپنے کچّے لفظوں کی پہلی فصل اٹھائے بازار میں پہنچا
تو دوسرے بیوپاری اور سب خریدار اور رہگیر
مجھے دیکھ کر برہم ہوئے
اور انہوں نے پتّھر مار مار کر مجھے اُٹھا دیا

مجھے میرے بچّوں نے گھر میں داخل نہ ہونے دیا

○

کل تکیوں سے ٹیک لگائے مجھے ایک بوڑھا بازی گر مِلا
اُس نے مجھے دیکھا اور ہاتھ اُٹھا کر مجھے دُعا دی
اور بتایا کہ
اسدؔ محمدؔ خاں اور احمدؔ ہمیش کو
اور وینگوؔ اور کبیرؔ داس کو کبھی آسودہ حالی نصیب نہ ہو گی
بس تکیوں سے ٹیک لگا لگا کر لوگ اُنہیں دیکھیں گے
اور پڑھیں گے
اور اُنہیں گا گا کر سر دُھنیں گے
اور مزے لے لے کر اُن کے پھل کھائیں گے

○

پھر بوڑھے بازی گر نے میرے شانے تھپتھپائے
اور کہا کہ تم تو بڑے خوش نصیب ہو
پھر وہ تکیوں سے ٹیک لگا کر رونے لگا اور بولا
مجھے دیکھو، میری تو گردن خالی ہے!

۷۴-۷۳

خواب کی نظم

میں اب اپنے خوابوں میں وہ شہر کیوں دیکھتا ہوں
کہ جس سے مری زرد آنکھوں میں
سو پھول کھلتے تھے
(اب دھول ہی دھول ہے)

اگر یہ
بس اک پھول کو دیکھنے کی ہوس ہے
جو اُس شہر کے راستوں میں
مجھے آج بھی خاک چھنوا رہی ہے
تو پھر آج کے بعد، ہر رات، سونے سے پہلے
یہ کہتا رہوں گا کہ وہ پھول تو میری آنکھوں میں کِھلتے تھے
اور میری آنکھیں
مِرے پاس ہیں۔

۷۱ء

گلی میں آواز دو

گلی میں آواز دو :
"کوئی ہے ؟
"یہاں کوئی ہے ؟؟
" ارے کوئی ہے ؟؟؟"
تو اپنا نیکر سنبھالتا
چھ برس کا بچّہ
(حرامزادہ !)
گلی کے ہر اک مکاں سے نکلے ....
مکاں سے نکلے گا اور کہے گا :
"یہاں سبھی ہیں .....
سبھی ہیں بس ایک میں نہیں ہُوں !"

۱۹۷۱ء

گارنیچ کلکٹر

رات کو سونے سے پہلے
اپنے سارے گیت لکھ لو
اپنی سب نظموں کا اِملا ٹھیک کر لو
صبح کو شاید کفن لے کر
مورّخ آئے گا
رامؔ بابو سکسینہ آئے گا۔

۱۹۷۱ء

دِس اِز اَ رِکارڈنگ

گنّا پیلتے ہوئے
اور رہٹ چلاتے ہوُئے
اور گھاس کھودتے ہوُئے
ماہیا کیوں گاتے ہو؟
تم کونسی فزی کوئنسی پر زندہ ہو؟
اور کیا تم ابھی تک مَرے نہیں
مَرے نہیں — مَرے نہیں — مرے نہیں
مَرے نہیں ....
رے نہیں ...
نہیں ... ن ...

۱۹۷۱ء

سِنگل — ڈبل مَرڈَر

سو اس تیسرے نے
کہ جو دوسرے کی طرح
صرف نفرت کی بو سونگھ سکتا تھا
اپنے ہی پہلو میں اک میخ ٹھونکی
اور اپنے ہی حلقوم میں
انگلیاں گاڑ دیں
اور اپنے ہی مُڑتے ہوئے سبز ہونٹوں سے
اتنا کہا:
"دوسرے! او کمینے!!"

۱۹۷۱ء

اُتّم تار نئی طرزیں

تو اب ٹین بجاؤ
اور منہ پر کلائی رکھ کر بکرا بلاؤ
کہ ہم نے سِتار کے کدو میں
بجلی کے برَمے سے
ساتھ سوُراخ کر دیے ہیں:
سا رے گا ما پا دَھا نِی

۱۹۷۱ء

ہم لوگ

ہم سب ۳۵ - ۳۵ برس کے اینگری ینگ مین ہیں
اسی لیے اپنے بچّوں پر خفا ہوتے ہیں
اور اِسی لیے فری کوُ کے نام پر
ہمارے پیٹ میں
اور پیٹ کے نیچے اینٹھن ہونے لگتی ہے
اور اسی لیے ہم ۲۴ نمبر کا پولی کلور استعمال کرتے ہیں
اور اللہ نے چاہا
تو دو چار برس میں
ہمیں تصوّف ہو جائے گا۔

۱۹۷۱ء

نےٹِو ہوسپی ٹیلٹِی

سرکار ـــ کوئی جان گلکرائسٹ صاحب آتے ہیں۔

بٹھاؤ ـــ پوچھو کیا شوق فرمائیے گا؟

حضورؐ ـــ کہتے ہیں پولو کھیلوں گا

تو اپنے میراَمّن کو بھیج دو

۱۹۷۱ء

پس اے ڈون کیہوٹے

تو اے ڈون کیہوٹے
سب سے بُری بات یہ ہے کہ
ہم لوگ اپنی حماقت پہ ہنسنا نہیں جانتے
پس اے ڈون کیہوٹے
تم بھی
انگرکھا پہن کے قرابین بھر کے
یہیں آن بیٹھو.....
اور اگلا، تمہاری وہ باتیں نہ سمجھے
کہ جو آج تک خود تمہاری سمجھ میں نہیں آسکی ہیں
تو
اُس کو
اُڑا دو!

۱۹۷۲ء

سُورج توسَب کا دَھن ہے

اُپلے تھاپتے
آخر تم شرماتی کیوں ہو؟
مُڑ مُڑ کے کیا دیکھتی ہو؟
لوگ تو اپنے بُرے کام کی سند بھی
آسمانی کتاب سے لاتے ہیں

لڑکی ——
سورج تو سب کا دَھن ہے
جو جیسے چاہے استعمال کرے

۱۹۷۱ء

کھڑکی بھر آسمان

بائیں ہاتھ پر آسمان دوڑ رہا ہے
اور مجھے زنجیر پر اور نیند پر کوئی اختیار نہیں
کہ میرے بائیں ہاتھ پر تم بیٹھے ہو
اور دائیں ہاتھ پر دیوار سے ٹیک لگائے موٹا اُونگھ رہا ہے
اور کھڑکی سے جس قدر آسمان تم کو نظر آتا ہے
وہ تمہارا ہے
اور جس قدر آسمان مجھ کو نظر آتا ہے
وہ میرا ہے
پر میرے آسمان میں تمہارا احمق سِلوُ اَیٹ پھَنسا ہوُا ہے

سو میرا آسمان تمہارے آسمان سے کچھ کم ہے
اور اگر موٹا جاگ رہا ہوتا
تو اُس کا آسمان
میرے آسمان سے بھی کم ہوتا

○

میں اگر تم کو قتل کر دوں
تو مجھے کھڑکی بھر آسمان مل جائے گا
اور اگر
موٹا اونگھنا چھوڑ کر تمہیں اور مجھے قتل کر دے
تو اُسے کھڑکی بھر آسمان مِل جائے گا
سو مجھے پہلے موٹے کو،
پھر تمہیں،
قتل کر دینا چاہیے
یا زنجیر کھینچ لینی چاہیے
یا سو جانا چاہیے۔

۱۹۷۱ء

گیزہ کا سب سے چھوٹا ہَرم

دو برتنوں میں روشنی اُمید کی
دو برتنوں میں صرف گیندے کی مہک
پھر ایک شیشے میں دھنک
اور راگ بھیروں
دوسرے شیشے میں آنسو
وہ جو میں نے خوبصورت عورتوں اور دوستوں کی یاد میں
ضائع کیے۔

اور دور کونے میں دھری
صندل بھری اک پالکی
(وہ پالکی جو ق۔م۔ ۱۹۳۵ یا ۳۶ میں اماں نے میلے میں خریدی تھی)
...... یہ سب چیزیں مری
اور پالکی کے پاس میلی دھجیّوں میں
گھاس کا چھوٹا سا اِک فرعون
مَیں۔

۱۹۷۱ء

تو پھر یہ دیکھا

تو پھر یہ دیکھا کہ روشنی کے حصار میں ایک دیو قامت شجر کھڑا ہے
کہ جس نے شانوں پہ بے شمار شاخیں اُٹھا رکھی ہیں
کہ بے شمار شاخوں پہ اَن گنت کونپلیں کھڑی ہیں
جو اپنی آنکھوں کی نرمیوں سے نمو کا اعجاز دیکھتی ہیں
اور اپنی زندہ سماعتوں میں
لہو کی آواز سُن رہی ہیں

تو پھر یہ دیکھا
نہ کوئی کونپل نہ وہ شجر ہے
بس ایک میں ہوں کہ بے نمو ہوں
اور اک ازل ہوں
بس ایک میں ہوں کہ بے نیابت ہوں
اور اَبد ہوں

بس ایک میں ہوں
کہ زرد مٹّی میں پنڈلیوں تک دھنسا ہُوا ہوں

۱۹۷۱ء

سلامتی کا گیت

میں : سلامتی سلامتی

کورس: سلامتی سلامتی سلامتی

میں : پنچھن کا کام ہی پنچ کرنا ہے

کورس: پنچھن کا کام ہی پنچ کرنا ہے

میں : اگر اپنی پسند سے وہ یوں کرتے

کہ سب پنچھن مل کر

بڑی طاقت سے

دو مضبوط درختوں کے لچکدار تنے

ایک دُوسرے کے قریب لاتے

اور ایک تنے سے میرا ایک ہاتھ اور ایک پیر

اور دوسرے تنے سے میرا دوسرا ہاتھ اور

دوسرا پیر

باندھ دیتے

اور جب تک میں اچھی طرح دونوں تنوں سے
باندھ نہ دیا جاتا
اُس وقت تک درختوں کو جھکائے رکھتے
پھر ایک ساتھ
اِن درختوں کو
اپنی فطری ایستادگی پر لوَٹ جانے کے لیے چھوڑ دیتے
تو بات سمجھ میں آنے والی تھی
اِس لیے کہ وہ لِنچِن تھے

کورس: اور لِنچِن کا کام ہی لِنچ کرنا ہے
میں : یا وہ یوں کرتے
کہ کسی ایک درخت کی اُفقی شاخ پر
میرے ہی کمر بند سے پھانسی کا پھندا ڈالتے
اور مجھے لٹکا دیتے

یا
مجھے آرے سے چیر دیتے
یا
کسی ستون سے باندھ کر جلا دیتے

یا
میری کھال اُتار کر مجھ پر نمک چھڑکتے

تو یہ سب ہی باتیں سمجھ میں آنے والی تھیں
اِس لیے کہ وہ پنچمن تھے

کورس: اور پنچمن کا کام ہی پنچ کرنا ہے
میں : مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا......

انہوں نے مجھے
میرے باہر
زندہ رکھا
(ہچکیاں) سلامتی سلامتی

کورس: ہمیں
ہمارے باہر
زندہ رکھا
(ہچکیاں اور بَین) سلامتی سلامتی

۱۹۷۵ء

لٹریری راؤنڈ اَپ

(دو)

وہ اپنی پتلون کے پچھلے سوراخ میں چاندی کا چمچا لے کر پیدا ہوا تھا۔
وہ اگر تمہیں "چشتی صاحب چشتی صاحب" کہتا ہے
تو اس میں بُرا ماننے کی کون سی بات ہے

وہ بڑا پیبا آدمی ہے
اگر مقدّمہ چلایا جائے تو شاہ ولایت ٹاؤن سے اکوڑہ خٹک تک
تمہاری حمایت میں ایک بھی آواز نہیں اُٹھے گی

مگر وہ بول پڑے گا
اگرچہ تمہیں چشتی صاحب سمجھتا ہے
اور تمہیں پڑھتا بھی نہیں
(تم وہ لکھنا ہی نہیں چاہتے جو وہ لکھوانا چاہتا ہے)

(تم)

مسئلہ یہ ہے کہ تم اپنا کیک کھانا بھی چاہتے ہو

اور اپنا کیک بچائے رکھنا بھی چاہتے ہو

کیپی ٹل والی گلی میں دن بھر اسٹول ڈالے بیٹھے رہو

اور ایک ایک روپیا

اور دو دو روپے

اور پانچ پانچ روپے

اور دس دس روپے

اور سو سو .....

اور ایک دن خود اپنا پرنس آف مِنَروا مووِی ٹون کھول لینا

اور پتلونوں کے پچھلے سوراخوں میں تھوک دینا

جہاں چمچے اُڑسے ہوئے ہیں

سُنا ہے گینڈوں کی نظر کمزور ہوتی ہے

وہ مڑ کر نہیں دیکھیں گے

○

اُسی ایک آدمی کو لو

اُس کا سالانہ اِنکریمنٹ "اوڈ ٹو دی وِسٹ وِنڈ" کے

بعد سے بند ہے

پچھلے سال برانٹے بہنوں کے ساتھ بدسلوکی کے جُرم میں
اُسے دُرّے لگائے جانے تھے
سو اُسے ترقّی دے دی گئی
وہ اب شعبے کا سربراہ ہے
اور اپنے خوابوں میں
یاہ یاہ یاہ
یاہ یاہ یاہ
یاہ یاہ یاہ
یاہ
یاہ
ایے یے
کہتا ہے اور پسینے پسینے ہو جاتا ہے
(یہی اُس کی مادری زبان ہے)

وہ اُن دو عورتوں کو پسند کرتا ہے
جو اپنے اپنے وظیفۂ زوجیت لکھ دینے کے بعد
قبولِ عام اور حبسِ دوام حاصل کر چکی ہیں

اور اب استعمال شدہ سینیٹری ٹاول سکھاتی
رہتی ہیں
یا ایک دُوسرے کے ساتھ
بیٹھے سے بیگار بھلی
کرتی رہتی ہیں
اللہ بڑا مسبّب الاسباب ہے
اِکادمی کے افتتاحی اجلاس میں
اُس کی شیروانی کا دامن کھینچتے ہوئے
ایسے ڈی سی نے آنکھوں میں آنسو بھر کر درخواست کی تھی
کہ ۲۰ برس سے باتیں کر رہے ہو
اب کچھ لکھو بھی۔

اُس نے وعدہ کر لیا ہے
اور ایک رِیم سادہ کاغذ لے کر
شعبے میں واپس آگیا ہے ......
اور اب چھت پر کھڑا ہوا کھُجا رہا ہے۔

۱۹۷۹ء

دیوار کی تین چیزیں

یہ سامنے دیوار پر جو کوئلے سے ۷۸۶ لکھا ہے

اور جو ZINDABAD ہے

اور فاختہ کی چونچ میں زیتون کی جو شاخ ہے

یہ تین چیزیں وہ ہیں

جو ان خوب صورت بچّیوں نے

اپنے اَبّو کے لیے تخلیق کی ہیں

تا کہ الّو چرخ پر جھولے
تو اک اللہ کو
اور فاختہ کی چونچ کو
اور اپنے "زندہ باد" کو
(اور اپنی چھوٹی سی حقیقت کو)
نہ بھولے
جھولتے
ہی
جھولتے
بس پار اتر جائے

۱۹۷۱ء

موت کی نظمیں

ایک

دو گڑھے ، کچھ فاصلے سے
ایسے
کہ آدھا آدھا 'میں' دونوں میں دفن
قطار اندر قطار لوگ
موت کی مُدرا میں لیٹے ہوئے
(کہ تنہائی میں موت، دوہری ابتلا ہے)

دو گڑھے ، کچھ فاصلے سے

ایسے

کہ آدھا آدھا 'میں' دونوں میں دفن

ایک بہت مصروف ایمبولینس

اپنی گھومتی ہوئی پھرکی سے تیز سرخ روشنی پھینکتی ہوئی

اپنے چپٹے لاؤڈ اسپیکر سے تیز سرخ آواز اچھالتی ہوئی

فریم میں داخل ہوتی ہوئی

پھر فریم سے باہر

پھر فریم میں داخل ہوتی ہوئی

بہت مصروف

دو

میں اپنے حلق سے جو آوازیں نکالتا ہوں

وہ اُس فریکوئنسی پر سنی جا سکتی ہیں

جو صرف میرے تصرّف میں ہے

ان میں ایک بڑی آواز موت کی آواز ہے کہ

آ ا ا ا ا ا

یہ آ اتنی دہشتناک ہے کہ

خود مجھے بھی اٹھا کر بٹھا دیتی ہے

(ورنہ لوگ، چالیس کے بعد، لوگ نہیں رہتے

جبلی میں تبدیل ہو جاتے ہیں)

تین

موت کی یہ پہچان ہے کہ

ایک شوخ رنگ کے گندے بریزیئر والی فاحشہ

جس کی بغلوں کے بال

(بدجناوروں کے پٹھوں پر اُگے چھدرے سیاہ تاروں کے گچھے)

پسینے میں اس درجہ بھیگے ہوئے

کہ لگتا ہو ہر لمحہ غسل جنابت کی کیفیت میں

بغلوں کے ادھ کھلے دہانوں سے

سیاہ اور زرد

زرد اور سیاہ

DECAY

چار دانگ عالم میں پھیلتا ہوا

اور یہ پہچان غیر منافقانہ، حتمی اور قطعی

مگر موت کی ایک پہچان

اور

بھی

ہے

چار

موت کے بچپن کا نام خوف ہے

میں بچپن میں موت سے نہیں ڈرتا تھا

کیوں کہ میری ماں زندہ تھی

اور میرے باپ کے پاس ایک رائفل تھی

خوف بزدل ہوتا ہے
ان کمروں میں داخل نہیں ہوتا
جن میں کھونٹیوں پر
ماؤں کے شال
اور باپوں کی رائفلیں ٹنگی ہوں

پانچ

میرے باپ کے پاس بہت سی چیزیں تھیں
ایک خوف سے محفوظ کمرا
زعفران خالص سے تحریر کیا ہوا ایک نقش
جو میرے دادا نے اپنے دستِ مبارک سے تحریر فرمایا تھا
اس پر اصحابِ کہف کے اسمائے مبارک درج تھے کہ
لطفقمفنجیح
صقبجفلکاس
اور میں اس نقش کے نیچے
کتّے کی طرح گٹھری بن کر سویا کرتا تھا
گٹھری بن کر سونے کی یہ نیکی میرے کام آئی
ورنہ میں تو کبھی کا مر چکا ہوتا

کہ خوف میرے ساتھ چودہ نمبر کی ویگن میں سوار ہوتا ہے
میرے برابر پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھتا ہے
میرے قریب سے اٹھ کر فلش کی زنجیر کھینچتا ہے
کرینیئم میں سوراخ کرتا ہوا
ٹیڑھا ترچھا تیرتا ہوا
گرے میٹر تک جا پہنچتا ہے
مواصلت کرتا ہے

چھ

رُک جاؤ
سائرن بند کر دو
اتر کر سگریٹ پی لو
پیشاب کر لو
اب کوئی جلدی نہیں ہے

اسٹریچر پر پڑا ہوا آدمی
اسٹریچر پر پڑی ہوئی چیز میں بدل چکا ہے۔

۱۹۸۰ء

ہارمنی

صبح جب مشینیں ایک دوسرے کی مدد کر رہی ہوتی ہیں
میں شکرگزاری میں جھک جاتا ہوں:
شکریہ، دوستو، شکریہ

ایک ٹرک دُوسرے کو ٹو کرتا لے چلتا ہے

ایک موبائل کرین بٹے ہوئے تاروں کا رسّا الجھا کر
دوسری موبائل کرین کو کھینچتی
اور جھٹکے سے اسٹارٹ کر کے چھوڑ دیتی ہے:
شکریہ، شکریہ، دوست!

۴۵ درجے زاویے کے انکلائن پر تُلا ہوا چھوٹا شنٹر
بے بس کریلے کو حیوانی خواہش کے ساتھ اوپر دھکیلتا ہے
انکلائن گزار کر
دوہری شدّت سے رگیدتا ہوا ہموار پلیٹ فارم پر لے آتا ہے۔
ایک آخری جھٹکے سے دھکیل کر اسٹارٹ کر دیتا ہے
اب کریلا ہاتھ ہلاتا گودام کے کھلے دروازے میں گھوم سکتا ہے:
خدا حافظ دوست، مہربانی، بہت مہربانی

میں شکر گزاری میں جُھک جاتا ہوں:
شکریہ، چیزو، شکریہ

کہیں نہ کہیں ہارمنی[۲] موجود ہے۔

---

[۱] CARELLA [۲] HARMONY

گھوڑا

میں گھوڑے کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں
وہ اوّلین شجر ہے
وہ بانس کے جنگل کی طرح راتوں رات اگتا ہے
اور ہواؤں کو سنسناتے ہوئے گزرنے کی اجازت دیتا ہے

گھوڑے کو خدا نے افضال احمد سیّد کی نظم کی طرح بنایا ہے
خوب چوڑا

سیاہ مٹّی سے پھوٹتا ہوا
سیاہ آسمان سے اُترتا ہوا
پرواز پر آمادہ

خدا نے ایک الوہی غصّے
پسینے
اور دھوپ بھرے گھاس کے میدان کو گوندھ کر
اس کی ہنہناہٹ ترتیب دی ہے،
اس کی ٹاپوں کی دھمک میں
قضا و قدر کے بے مروّت فیصلے جڑ دیے ہیں
اور اس کی رفتار کے دائیں بائیں
وہ دھندلے منظر پھیلا دیے ہیں
جن میں ٹھیک سے کچھ پتا نہیں چلتا کہ کیا ہو رہا ہے۔

خدا نے گھوڑے کی رفتار کے سامنے بھی منظر پھیلائے ہیں
بالکل سیدھ میں دیکھو تو وہ واضح اور طے شدہ نظر آتے ہیں
یہاں تک کہ

دو نیم ہو کر
دائیں اور بائیں تقسیم نہ ہو جائیں
اور دُھندلا نہ جائیں
خدا نے گھوڑے کی رفتار کے عقب میں
نیستی بچھا دی ہے
یا ایک آواز کہ
سَرَدَم دُکھَمّ دُکھَمّ
اور گھوڑا ان سب باتوں سے مِل کر بنا ہے

سچّے لفظ کہاں

سچّے لفظ کہاں چھوڑ آئے
کیا کُرتے میں جیب نہیں تھی ؟

۱۹۷۴ء

کل کہیں ایسا نہ ہو

میرے لفظ اگر تمہیں سُنائی نہیں دیتے
تو مجھ پر ہنستے کیوں ہو
اور مجھے پتّھر کیوں مارتے ہو؟

کل کہیں ایسا نہ ہو
کہ سماعتیں بحال ہو جائیں
اور یہ زخم تمہیں تکلیف پہنچائیں

۱۹۷۳ء

ترجمے

(ایذرا پاؤنڈ کی ۴ نظمیں)

اِرتا ہورا

"شکریہ — اب جو ہونا ہے ہوتا رہے"
اُس نے اتنا کہا
اور مجھے چھوڑ کر
تیز قدموں سے چلتی ہوئی
اک طرف مڑ گئی
جیسے پھولوں سے نِرَبل کرن روٹھ جائے

جب انہیں رُخ بدلتی ہوا
روشنی کی ڈگر سے ہٹاتے
(جیسے دل ٹوٹ جاتے)

اب جو ہونا ہے، ہوتا رہے
آج کی ایک ساعت کرن پھُول تھی
پے بہ پے روشنی میں نکھرتی ہوئی
آج کی ایک ساعت گزرتی ہوئی
کیسے کیسے خدا فخر سے دیکھتے
اور یہ کہتے کہ اس کے سوا دیدنی
کوئی منظر نہیں
اس کرن پھول کا کوئی ہمسر نہیں۔

البا

شیتل،
جیسے اوس میں بھیگی
زرد پتّیاں گیندے کی
صبح کی گود میں ساتھ مرے وہ لیٹی تھی

کوڑا

اے مرے گیتو!
کیوں تم ان لوگوں کے چہرے ایسے تجسّس، اتنے شوق سے
تکتے ہو؟

کیا تم اِن میں کھوئی ہوئی
اپنی لاشیں ڈھونڈ نکالو گے؟

اِن اَ اسٹیشن آف دی میترو

اسٹیشن کے اس ہجوم میں
چہروں کا آسیب
بھیگی، کالی شاخ پہ
بکھری
پنکھڑیاں ۔

(تادیوش روسےوِچ کی ۱۴ نظمیں)

خوف

تمہارا خوف بڑا ہے
ما بعد الطّبیعاتی ہے
میرا خوف چھوٹا ہے
بریف کیس اُٹھائے ہوئے کلرک کی طرح
جس کے پاس ریکارڈ کارڈز ہوں سوالنامے ہوں
کہ میں کب پیدا ہوا تھا
میری آمدنی کیا ہے

میں نے کیا کچھ نہیں کیا
میرا کس چیز پر ایمان نہیں ہے

میں یہاں کیا کر رہا ہوں
یہ ناٹک کب بند کروں گا
کیا کہیں اور جانے کا ناٹک
بعد میں رچاؤں گا

دُور دُور

اُس کی پھیلی ہوئی باہنیں اتنی دُور تک پھیل گئیں
کہ اُس کا بایاں ہاتھ
افق پر ٹِکے ہوئے ایک مُردہ درخت سے جا لگا
چھوٹا سا دایاں ہاتھ
سختی سے مٹّھی بھینچے بھینچے ماں کے ہاتھ میں گم ہو گیا
اُس کا سر کچل کچلا کر
وائلن کے ڈبّے جیسی سیاہ لمبوتری شکل میں ڈھل گیا
اور دانت اپنی جگہ چھوڑ کر
آنکھ اور کان کے درمیان ایک عمودی قطار بن گئے

وہ جنوری کے بلّوریں تابوت میں پڑا تھا
اُس کا بھائی جسے کبھی اسی کوکھ نے جنم دیا تھا
دھماکے سے پہلے یورپ چھوڑ چکا تھا
اور سمندر کے دوسرے کنارے پر بیٹھا پائپ پی رہا تھا

گمشدہ انجیل

لیکن یسوع جھکے
انہوں نے ریت پر لکھا
پھر وہ دوبارہ جھکے
انہوں نے انگلی سے لکھا
ماں وہ اتنے کند ذہن اور سادہ ہیں
کہ مجھے معجزے دکھانے پڑتے ہیں
میں ایسے بے مقصد
اور فضول کام کرتا ہوں

لیکن تو سمجھتی ہے

اور اپنے بیٹے کو معاف کر دیتی ہے

میں پانی کو مَے میں تبدیل کرتا ہُوں

مُردوں کو جِلاتا ہوں

سمندروں پر چلتا ہوں

وہ بچوّں کی طرح ہیں ذرا سوچ تو

کسی کو ہمیشہ

کوئی نہ کوئی نئی چیز دکھائی پڑتی ہے

جب مَتّی، مَرقُس، لُوقا اور یوحنّا

قریب پہنچ گئے

تو یِسوع نے ہاتھ پھیرا

اور اِن حروف کو

ہمیشہ کے لیے

مِٹا دیا

زندگی کے درمیاں

دُنیا کے خاتمے کے بعد
اور موت کے بعد
میں نے خود کو زندگی کے درمیان پایا
سو میں نے اپنی تخلیق کی
اور زندگی تعمیر کی
اور لوگ بنائے اور جانور بنائے اور مناظر تخلیق کیے
یہ میز ہے ، میں نے کہا

یہ میز ہے
میز پر ایک روٹی اور ایک چھُری ہے
چھُری، روٹی کاٹنے کے کام آتی ہے
لوگ روٹی کھا کے زندہ رہتے ہیں

آدمی سے محبّت کی جانی چاہیے
میں نے رات کے وقت اور دن کے وقت
دُہرایا اور یاد کیا

کس سے محبّت کی جانی چاہیے آدمی سے
میں نے جواب دیا آدمی سے

یہ کھڑکی ہے، میں نے کہا
یہ کھڑکی ہے
کھڑکی کے اُدھر باغ ہے
میں باغ میں سیب کا ایک درخت دیکھتا ہُوں
پھولوں سے لدا ہوا سیب کا درخت
پھول گرتے ہیں
پھل بننا شروع ہوتے ہیں
پکتے ہیں
میرا باپ ایک سیب توڑتا ہے
یہ آدمی جو سیب توڑ رہا ہے
میرا باپ ہے

میں ایک مکان کی دہلیز پر بیٹھ جاتا ہوں
یہ بوڑھی عورت جو بکری کی رسّی تھامے گزر رہی ہے
دُنیا کے ساتوں عجائبات سے زیادہ ضروری ہے .....
اُن سے کہیں زیادہ قیمتی ہے
جو کوئی بھی
یہ سوچتا اور محسوس کرتا ہے کہ یہ بُڑھیا ضروری نہیں ہے
وہ مجرم ہے
بنی نوعِ انسان کا قاتل ہے

یہ آدمی ہے
یہ درخت ہے، یہ روٹی ہے
لوگ کھاتے اس لیے ہیں کہ زندہ رہیں
میں دل ہی دل میں دُہراتا رہتا ہوں
انسانی زندگی بہت اہم ہے
انسانی زندگی کی اہمیّت بہت زیادہ ہے
زندگی کی قیمت
آدمی کی بنائی ہوئی ہر ایک چیز سے زیادہ ہے
آدمی ایک بے بدل خزانہ ہے

میں بڑے ضدی پن سے دُہراتا ہوں
آدمی ایک بے بدل خزانہ ہے

یہ پانی ہے، میں نے کہا
یہ پانی ہے
میں نے ہاتھ بڑھا کر لہروں کو چھُو لیا
اور دریا سے باتیں کیں
پانی سے کہا
مہربان پانی
یہ میں ہوں

تو آدمی نے پانی سے کلام کیا
چاند سے کلام کیا
اور پھولوں سے اور بارش سے
اور اُس نے زمین سے کلام کیا
اور چڑیوں سے
اور آسمان سے باتیں کیں

آسمان چُپ تھا
زمیں چُپ تھی
(بڑی خاموشی تھی)
اور اگر اُس نے آواز سنی
جو زمین سے اور پانی سے اُٹھ رہی تھی
اور آسمان سے اتر رہی تھی
تو خبر ہو
کہ وہ
دوسرے انسان کی آواز تھی

یوم کپور[1]

میں اور میرے جد یوم کپور میں ہیں۔

اور میں اور میرے جد بنی اسرائیل کے وہ قبیلے تھے جو اپنے بھائی بندوں کی حرمزدگیوں سے بیزار ہو، اپنے اپنے ید بیضا اپنی بغلوں میں مار، ارضِ موعود کی تلاش میں اُلٹے چلتے ہوئے پہاڑوں پہاڑ اِدھر آ نکلے تھے۔

پھر ایک قاصدِ فرخندہ فال نے ہموار زمینوں اور سمندروں اور جنگلوں کو نوید پہنچائی کہ صدق کا سورج طلوع کی منزلوں میں آ گیا ہے۔ سو ہم نے گینڈے کی سی گردن والے اپنے سردار الف خان سے پکار کر کہا کہ - الف خانا! او بے پیر، ٹیلے سے نیچے اُتر آ اور اپنے تیغے کو زمیں بوس کر دے، یہ رجز خوانی بند کر اور سن لے کہ قبیلۂ قریش تو آج سب قبیلوں پر سبقت لے گیا۔ خدائے موسیٰ کی قسم اُس قبیلے کے آسماں شکوہ ہاشم خیل میں تو زمینوں اور آسمانوں کے سرورؐ نے ظہور کیا ہے۔ او الف خانا، کعبۃ اللہ کی طرف منہ کر لے کہ سُورج کی سی پیشانیوں والے آج ابراہیمؑ کے گھر کی سمت مڑ گئے ہیں۔

---

[1] یوم کفارہ (YOM KIPPUR)

سو الف خان ٹیلے سے نیچے اُتر آیا، اس نے تیغہ پھینک کر چار بڑی سمتوں میں سجدے گزارے کہ اُس کم آگاہ کو کعبۃ اللہ کی صحیح سمت معلوم نہ تھی۔ پھر اس نے وَدِئی، کہہ کر نعرہ مارا اور پھرکی جیسے گھومنا شروع کیا یہاں تک کہ اس کا پیراہن خانہ بدوشوں کے خیمے کی طرح پھیل گیا۔ وہ گھومتا جاتا تھا اور نعرہ زن تھا کہ، ٹول سرفرازئے، ڈیرے قسمتئے، خدائے رَخمتئے، ودِئ ودِئ ودِئ، دِرِگہ، دِرِگہ، دِرِگہ۔ پھر اُس آواز میں جو بلندی سے لڑھکتے پتّھروں جیسی تھی اور فرطِ انبساط سے پہلی بار لرزتی تھی اور نمی سے بوجھل تھی اُس نے کہا کہ للہ الحمد آج سے ہمارے تیغے ہاشم خیل کی چاکری میں آ گئے۔ ٹول سر بلندئے، ڈیرے سرفرازئے، رخمتئے مخامخ، دِرِگہ دِرِگہ دِرِگہ۔ پھر الف خان کو تاہ گردن سے کچھ اور نہ بن پڑا تو بے انتہا شادمانی سے نڈھال ہو کر اس نے پتّھروں سے ٹیک لگائی اور رونا شروع کر دیا — یہ رُوئے زمین پر الف خاں کا پہلا گریہ تھا۔

سو اے ارضِ موعود! میں روتا ہوں۔ اور اے ارضِ موعود! میں روتا ہوں۔ اور اے ارضِ موعود! میں تو بھولا بسرا قبیلہ تھا اور اپنے یدِ بیضا اپنی بغلوں میں مار تیری تلاش میں نکلا تھا۔

سو میں (کہ میرا جد) آفریدئے دوست خان اپنے ۱۹ رفیقوں کے ساتھ جنوب کی ٹیکری پر چڑھا اور طشت نما وادی پر نظر ڈالی جہاں کفّار سے کفّار نبرد آزما تھے اور بلا کا شور کرتے تھے۔ آفریدئے دوست خان نے کچھ دیر اُن کے طریقِ جنگ کا مشاہدہ کیا اور طشت نما وادی کے لشکر کو پسپائی کی جنگ لڑتے دیکھا، پھر بیزاری سے منہ پھیر کر جماہی لی اور بولا " یہ کون لوگ ہیں؟ واللہ ان قرمساقوں کو جنگِ مغلوبہ کا بھی شعور نہیں"۔ پھر اس نے اپنے گھوڑے کی ایال سے کھیلتے ہوئے اَلسائی ہوئی آواز میں پوچھا، " وزیر خان، یہاں سے

قلعۂ رائے سین کے فرسنگ ہو گا؟"

مگر نہیں — دوست خان نے قلعۂ رائے سین کی بابت نہیں پوچھا تھا، اور شاید اُس کے پاس گھوڑے بھی نہیں تھے۔ اس نے اپنے گھوڑے بیچ کر قافلے کی خوراک کا بندوبست کیا تھا۔ اور میرے ابّا بتاتے ہیں کہ جدِّ مکرّم دوست خان اور اس کے ۱۹ رفیقوں کے پاس بس بے نیام تیغے اور ستّو کی چند پوٹلیاں باقی بچی تھیں اور یہ بیس طالع آزما درّۂ خیبر کے کسی علاقے تیراہ سے آئے تھے اور آفریدے دوست خان، سردارِ قبیلہ کا بیٹا تھا اور اپنے بھائی سے روٹھ کر قسمت آزمانے مغلوں کی قلمرو میں در آیا تھا اور جس دن اس نے جنوبی ٹیکری پر کھڑے ہو کر کفّارِ مالوہ کے دو خوں آشام لشکروں کو کھانڈے سے کھانڈا بجاتے دیکھا اُس دن رکھشا بندھن کا تہوار تھا مگر لینگی ناچنے کی بجائے اہلِ ہنود کھانڈے سے کھانڈا بجا رہے تھے اور اگر جدِّ اعلیٰ آفریدے دوست خان توجّہ نہ فرماتا تو ہزیمت وادی طشت کی رانی کا مقدّر تھی۔ سو اس نے توجّہ فرمائی اور ہارتے ہوئے لشکر کے شانہ بشانہ جنگ کی اور فتح مند آیا۔ مگر دوست خان کو ان کا طریقِ جنگ ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ ہر چند کہ آب و ہوا معتدل تھی اور لوگ وفا سرشت تھے۔ شاید اسی لیے اس نے کچھ دن وہاں قیام کرنے کا فیصلہ کیا اور بالآخر وہیں دفن ہُوا اور اُس کی ذُرّیت وہاں کئی سو برس ٹھہری۔

اور رانی کملا پتی نے ستی ہونے سے ایک ساعت قبل شکر گزاری میں آفریدے دوست خان کی بالشت بھر چوڑی کلائی پر راکھی کا طلائی دھاگا باندھ دیا اور اپنے نو عمر کنور کو جو اسی جنگ میں یتیم ہوا تھا، خان کی تولیت میں دیا پھر اپنے لشکر کی فتح کا شنکھ سنتی ہوئی سات داسیوں کے ہمراہ محل کی ان سیڑھیوں تک پہنچی جو آج بھی زیرِ آب ہیں۔ اور جل پوجا کرتی کٹورا سے تال میں اترتی

چلی گئی اور ستی کہلائی۔

اور نال کے گرد اگرد جنّت پہاڑیاں تھیں اور سیتا پھلوں کے بن اُمڈے پڑتے تھے اور کھیتوں کی مٹی نپٹ سیاہ تھی اور رکھشا بندھن کے تیوہار پر چندن موسی، مہامائی کی پوجا سے فارغ ہوتی تو میرے باپ آفریدے عزت خان کی چوڑی کلائی پر راکھی باندھنے سیدھی ہمارے گھر آتی تھی۔ اور دو جوروؤں والا ٹھاکر جس کے کانوں میں سونے کی مندریاں جھولتی رہتی تھیں، دارو پی کر دونوں جوروؤں کے ساتھ ایک بیل گاڑی میں لد جاتا اور موسی کے پیچھے پیچھے چلا آتا اور میں بچّہ ہی تھا سو اسے دیکھ کر بہت ہنستا تھا۔ اور وہ ہمارے صحن میں لینگی ناچتا تھا کہ ارے لگ گئی رے بُھنسارے کی نیند، لگ گئی رے —— سو میری آٹھ پشتیں وہاں نیند کرتی ہیں۔

اور میرے دادا آفریدے کمال خان کا پردادا آفریدے نصرت خان چوتھی پشت میں دوست خان بانیٔ ریاست کی صُلب تھا اور وہ جرنیل تھا اور اسی گھر میں جہاں رکھشا بندھن پر میں دو جوروؤں والے ٹھاکر کو دارو پی کر ناچتے دیکھتا تھا، اسی گھر میں سنہ اٹھارہ سو کچھ میں زبردست آتشزدگی ہوئی تھی اور آفریدے نصرت خان نے، کہ زمین کی طرح سانولا اور تاڑ کی طرح لمبا تھا اور اسی لیے کولی خان کہلاتا تھا، اللہ اکبر کا نعرہ مارا تھا اور جلتی ہوئی چھت کو الانگ گیا تھا اور جلتی ہوئی دیواروں اور جلتے ہوئے طاقچوں پر چڑھتا اترتا اور جلتے ہوئے دروازوں سے گزرتا جزدان میں لپٹا ہُوا قرآن مجید سینے سے لگائے نعرے مارتا صحیح و سالم واپس آ گیا تھا اور میرا دادا آفریدے کمال خان حُبِ قرآن میں گریہ کرتا تھا اور کہتا تھا کہ تاریخ ہند کی جلد نمبر فلاں میں پنڈاریوں کی سرکوبی کے ذیل میں آفریدے نصرت خان المعروف بہ کولی خان جرنیل کی

معرکہ آرائیاں مرقوم ہیں اور دادا آفریدئے کمال خان مجھ سے کہتا تھا کہ لڑکے
جب کولی خان بہادر تیرے اس جلتے ہوئے مکان میں قرآن لینے کُودا تو پُرکھوں
نے بآوازِ بلند انّا للہ و انّا الیہ راجعون پڑھا اور تمام پُرکھے اتّفاقِ رائے سے
ملول ہوئے کہ ہیہات ! ایک متشرّع مسلمان کی میّت کو مٹّی نصیب نہ ہو سکی
اور مثل اہلِ ہنود کے سوختہ ہُوا۔ مگر جب آفریدئے نصرت خان کلام مجید کو
سینے سے لگائے شعلوں کی دیوار چیر کر طلوع ہُوا تو پُرکھوں نے نعرہ کیا
کہ ڈیرے قِسمَتے، ٹول سرفرازئے، ٹول سربلندئے، وئی وئی وئی اور شادمانی
سے نڈھال ہوا، انھوں نے پتّھروں سے ٹیک لگائی اور رو کر کہا کہ ہاشم خیل کے
چاکروں کا چاکر نصرت خان سرخ رو آیا اور الف خان کوتاہ گردن کی صُلب
مشکور ہوئی اور زمینوں اور آسمانوں کے سرورؐ نے اس قبیلے کو اپنی چاکری میں
سرفراز فرمایا اور نمی سے بوجھل آوازوں میں انھوں نے درود و سلام پڑھے
اور گریہ کیا۔

سو اے ارضِ موعود! میں روتا ہُوں اور اے ارضِ موعود! میرا جَد سچّا تھا کہ
وہ اپنے تیراہ کے لیے گریہ کرتا تھا اور اپنے بڑے بیٹے کو روتا تھا جو ٹورنامنٹ
کھیلتے ہوئے چھاتی پر گیند لگنے سے شہید ہوا اور میرا باپ سچّا ہے، وہ اپنے
بیٹے کو روتا ہے جو سب تیرا ہوں سے دور لیاقت آباد کی ایک کشادہ قبر میں
۴۳ سال سے دفن ہے اور بنو ہاشم کی قسم، میں سچّا ہوں کہ روتا ہوں۔

اور اے ارضِ موعود کبھی کبھی شام کو دو جوڑوں والا اٹھا کر بھی داروپی
کر روتا تھا اور اَبا سے اپنے الکو ہلک دکھ بیان کرتا تھا اور گنّے کے کھیت
کی طرف منہ کر کے اپنے مفروضہ دشمن کو للکارتا تھا کہ بھیتر کا ہے گھس گیو
سَورے ایدَھر آ کچُو دِیکے مھارے منجھے بھیّا کے تائیں بندوخ ہے، سَورے

کو گوڑی مروا دیگو۔ اور میرے بڑے بھائی کے پاس ایک ایئرگن تھی اور گرمیوں کی چھٹیوں میں ہم دونوں سیسا پگھلا پگھلا کر پنسل کے سانچوں میں ڈالتے جاتے تھے اور بڑے نفیس چھرّے بناتے تھے اور اُس اندھے لڑکپن میں اُجلی اُجلی فاختاؤں کو ہلاک کرتے تھے۔ سو اب روتا ہوں اور اسے ارضِ موعود! میں روتا ہوں کہ میں نے فاختائیں کیوں ہلاک کیں۔

باسودے کی مریم

مریم کے خیال میں ساری دنیا میں بس تین ہی شہر تھے۔ مکّہ، مدینہ اور گنج باسودہؔ۔
مگر یہ تین تو ہمارا آپ کا حساب ہے، مریم کے حساب سے مکّہ، مدینہ ایک ہی شہر
تھا:" اپنے حجور کا سہر"۔ مکّے مدینے سریپ میں اُن کے حجور تھے اور گنج باسودے
میں اُن کا ممدو۔

ممدو اُن کا چھوٹا بیٹا تھا۔ اُس کے رخسار پر " اتّا بڑا " ناسور تھا۔ بعد میں
ڈاکٹروں نے ناسور کاٹ پیٹ کر رخسار میں ایک کھڑکی بنادی تھی جس میں سے
ممدو کی زبان پانی سے نکلی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپتی رہتی تھی۔ مجھے یاد ہے، پہلی
بار مریم نے امّاں کو سرجری کا یہ لطیفہ سنایا تھا تو میں کھی کھی کرکے ہنسنے لگا تھا۔
اگر مریم اپنے کھردرے ہاتھوں سے کھینچ کھانچ کر مجھے اپنی گود میں نہ بھرلیتیں
تو میری وہ پٹائی ہوتی کہ رہے نام اللہ کا۔" اے دُلھین! بچّہ ہے۔ بچّہ ہے ری
دُلھین! بچّہ ہے"۔ مگر اماں نے غصّے میں دو چار ہاتھ جڑ ہی دیے جو مریم نے
اپنے ہاتھوں پر روکے اور مجھے اٹھا کر اپنی کوٹھری میں قلعہ بند ہوگئیں۔ میں
مریم کے اندھیرے قلعے میں بڑی دیر تک ٹھُس ٹھُس کرکے روتا رہا۔ وہ اپنے

اور میرے آنسو پونچھتی جاتی تھیں اور چیخ چیخ کر خفا ہو رہی تھیں: "اے ری دُلھین، یہ اللہ کی دَین ہیں... نبی کے اُمتّی ہیں۔ انہیں مارے گی، کوٹے گی تو اللہ نبی کُھش ہوں گے تجھ سے؟ توبہ کر دُلھین! توبہ کر۔"

پھر وہ طرح طرح سے کھڑکی اور مچھلی والا لطیفہ سنا سنا کر مجھے بہلانے لگیں۔ "تو بیٹا ڈانگدروں نے کیا کیا کہ حرامیوں نے ممدو کے گال میں کھڈکی بنا دی اور کھڈکی میں سے تھرک تھرک، تھرک تھرک..." مریم کا دل بہت بڑا تھا اور کیوں نہ ہوتا، اُس میں اُن کے جور کا مکّہ مدینہ آباد تھا اور سینکڑوں باسودے آباد تھے۔ جن میں ہزاروں لاکھوں گُل گتھنے ممدو اپنی گول مٹول مٹھیوں سے مریم کی دودھوں بھری ممتا پر دستک دیتے رہتے تھے "انّا بُوا! دروازہ کھولو۔ اللہ کی دَین آئے ہیں۔ نبی کے اُمتی آئے ہیں۔"

مریم نے میرے ابا کو دودھ پلایا، وہ میری کھلائی اور میری پناہ تھیں، وہ میرے بھانجے بھانجیوں کی انّا تھیں اور ابھی زندہ ہوتیں تو انھی بھانجے بھانجوں کے بچّے اپنے چارج میں لیے بیٹھی ہوتیں۔ میری تین پشتوں پر مریم کا احسان ہے۔

میں نے ایک بار مریم کے قلعے میں گھس کر اُن کی پُٹلیا سے گڑ کی ایک بھیلی چرا لی۔ مریم بچّوں کو بگاڑنے والی مشہور تھیں۔ مگر مجال ہے جو بڑے جرائم میں کسی کی حمایت کر جائیں۔ انہوں نے فوری طور پر اماّں سے میری رپورٹ کر دی اور امّاں، خدا انہیں خوش رکھے، جاگیردار کی بیٹی، کھری پٹھانی اپنی اولاد سے کوئی گھٹیا فعل منسوب ہوتے دیکھ ہی نہیں سکتیں۔ انہوں نے جلال میں آ کر اُلٹا مریم سے اَن بولا کر لیا۔

ابا کو پتا ہی نہ تھا کہ گھر میں سرد جنگ جاری ہے۔ وہ اُسی طرح عشا کی نماز کے بعد پندرہ بیس منٹ کے لیے مریم کے پاس بیٹھ کر اُن کا

حال احوال پوچھتے، مریم کے پاؤں دابنے کی کوشش کرتے اور ان کی پیار بھری جھڑکیوں کی دولت سمیٹ کر اپنے کمرے میں سونے چلے جاتے ۔

تین چار دن میری یہ دو جنتیں ایک دوسرے سے برگشتہ رہیں اور میں گنہگار عذاب جھیلتا رہا۔ اماں نے مریم کی دیکھ بھال میں کوئی کوتاہی تو نہ کی مگر مریم کا سامنا ہو جاتا تو اماں کے نازک خدوخال آپ ہی آپ سنگ و آہن بن جاتے۔ مریم زیادہ تر اپنی کوٹھری میں محصور رہیں اور شاید روتی رہیں، آخر جو تھے پانچویں دن میں پھوٹ بہا اور پٹائی کے خوف سے بے نیاز ہو کر اماں کی گود میں سر رکھ کر میں نے اقبالِ جرم کر لیا۔ اماں کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ بس ایک غضب کی نگاہ کی، مجھے ایک طرف دھکیل کر اُٹھ کھڑی ہوئیں اور بجلی کی سی تیزی سے مریم کے قلعے میں داخل ہو گئیں " انّا بوا ! تمہارا منجلا تو چور نکلا۔ بُوا ! ہمیں معاف کر دو۔" میں نے کواڑ کی آڑ سے دیکھا کہ مریم لرزتے ہاتھوں سے اماں کے دونوں ہاتھ تھامے انہیں چوم رہی ہیں۔ کبھی ہنستی ہیں ، کبھی روتی ہیں اور کبھی اماں کو چپت لگانے کا ڈراما کرتی ہیں " بس ری دلھین ! بس کر، چپ ری دُلھین ! چپ کر۔ دیکھ، میں مار بیٹھوں گی۔"

مریم سیدھی سادی میوانن تھیں۔ میری خالہ سے مرتے دم تک صرف اس لیے خفا رہیں کہ عقیقے پر ان کا نام فاطمہ رکھ دیا گیا تھا۔" ری دُلھین ! بی بی پھاطمہ تو ایکئی تھیں۔ نبیؐ جی سرکار کی سہجادی تھیں، دنیا آکھرت کی باچھا تھیں۔ ہم دوجخ کے کُندے بھلا اُن کی برو بری کریں گے۔ توبہ توبہ استگپھار۔"

محرّم میں نویں اور دسویں کی درمیانی شب وہ خشوع و خضوع سے تعزیے، سواریاں اور اکھاڑے دیکھتیں، خوب خوب پا پڑ پکوڑے کھاتیں کھلاتیں اور دسویں کو صبح ہی سے " وجو بنا کے " بیٹھ جاتیں، ہم لڑکوں کو پکڑ پکڑ کر دن بھر شہادت نامہ

سنتیں یا کلمۂ طیبّہ کا ورد کرتیں، اور خدا مغفرت کرے، کلمہ شریف بھی جس طرح چاہتیں پڑھتیں: "لاالا ہا اِل بِلاّ نبی جی رسول اِلاّ۔ حجوُر جی رسول اِلاّ۔"

امام حسینؓ کا نام لے لے کر بین کرتیں، رو رو کر آنکھیں سُجا لیتیں اور بین کرتے کرتے گالیوں پر اُتر آتیں "رے حرامیوں نے میرے سہجادے کو مار دیا۔ رے ناس مٹوں نے میرے باچھا کو مار دیا۔"

محرّم میں وہ ہم لڑکوں کو حسنؓ حسینؓ کے فقیر بناتی تھیں۔ ہمارے کُرتے ہرے رنگ دیتیں۔ گردنوں میں کلاوے ڈال دیتیں اور چھوٹی چھوٹی بٹونیاں سی کر اُن میں دو دو آنے کے پیسے ڈال، سیفٹی پنوں سے ہمارے گریبانوں میں ٹانک دیتی تھیں۔

حق مغفرت کرے، ہمارے دادا میاں مرحوم تھوڑے سے وہابی تھے۔ ابا بھی اُن سے کچھ متاثر تھے پر محرّم کے دنوں میں مریم کے آگے کسی کی وہابیت نہ چلتی۔ دس روز کے لیے تو بس مریم ہی ڈکٹیٹر ہوتیں مگر یہ ڈکٹیٹری بھی "جیو اور جینے دو" کے اصول پر چلاتی تھیں۔ ہمیں فقیر بنا کر چپکے سے سمجھا دیتی تھیں "دیکھ رے بیٹا! بڑے میاں جی کے سامنے مت جانا۔"

اور بڑے میاں جی بھی، خدا اُن پر اپنی رحمتوں کا سایہ رکھے، کمال بزرگ تھے۔ ظاہر تو یہ کرتے تھے جیسے مریم کی ان باتوں سے خوش نہیں ہیں۔ پر ایک سال محرّم کے دنوں میں مریم باسودے چلی گئیں۔ ہمارے گھر میں نہ شہادت نامہ پڑھا گیا، نہ ہائے حسینؓ ہوئی، نہ ہم فقیر بنے۔ عاشورے پر ہم لڑکے دن بھر ہاکی کھیلتے رہے۔ عصر کی نماز پڑھ کر دادا میاں گھر لوٹ رہے تھے۔ ہمیں باڑے میں اُدھم مچاتے دیکھا تو لاٹھی ٹیک کر کھڑے ہو گئے "ابے کرشٹانو! تم حسنؓ حسینؓ کے فقیر ہو؟ بڑھیا نہیں ہے تو جانگیے پہن کے اُدھم مچانے لگے۔ یہ نہیں ہوتا کہ آدمیوں کی

طرح بیٹھ کے یاسین شریف پڑھو۔"

یاسین شریف پڑھو حسنؓ، حسینؓ کے نام پر، یاسین شریف پڑھو بڑے میاں جی کے نام پر، یاسین شریف مریم کے نام پر اور ان کے ممدو کے نام پر کہ ان سب خوبصورت ناموں سے تمہاری یادوں میں چراغاں ہے۔

مگر میں ممدو کو نہیں جانتا۔ مجھے صرف اس قدر علم ہے کہ ممدو باسودے میں رہتا تھا اور ڈانگدروں نے اس کے گال میں ایک کھڈ کی بنا دی تھی اور اس کھڑکی کے پٹ مریم کی جنّت میں کھلتے تھے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جب مریم بڑے سوز کے ساتھ کھواجہ پیا جرا کھولو کِوڑیاں گاتی تھیں تو امّاں کی کوئلوں جیسی آواز اُن کی آواز میں شامل ہو کر مجھ پر مزار جنّتوں کے دروازے کھول دیتی تھی۔ میں امّاں کے زانو پر سر رکھ کر لیٹ جاتا اور خواجہ پیا کو سُروں کے معصوم جھروکے سے درشن بانٹتے دیکھا کرتا۔ سُنا ہے، میری امّاں موج میں ہوتی ہیں تو اب بھی گاتی ہیں۔ خُدا انہیں ہنستا گاتا رکھے پر مریم کی آواز تھک کر سو چکی ہے یا شاید ایک لمبے سفر پر روانہ ہو چکی ہے اور مکّے مدینے سر پیپ کی گلیوں میں پھول بکھراتی پھر رہی ہے یا باسودے کے قبرستان میں ممدو کو لوریاں سنا رہی ہے۔

سفر مریم کی سب سے بڑی آرزو تھی۔ وہ حج کرنا چاہتی تھیں۔ ویسے تو مریم ہمارے گھر کی مالک ہی تھیں مگر پتا نہیں کب سے تنخواہ لے رہی تھیں۔ ابّا بتاتے ہیں کہ وہ جب اسکول میں ملازم ہوئے تو انہوں نے اپنی پہلی تنخواہ مریم کے قدموں میں لا کر رکھ دی۔ مریم پھول کی طرح کھل اُٹھیں، اپنی گاڑھے کی چادر سے انہوں نے ایک حوَنّی کھول کر ملازمہ کو دی کہ جا بھاگ کے بجار سے زلے بیاں لیا۔ مریم نے خود ان جلیبیوں پر کلمہ شریف پڑھا اور تنخواہ اور جلیبیاں اُٹھا کر بڑے غرور کے ساتھ دادا میاں کے سامنے رکھ آئیں "بڑے میاں جی! مبارک ہو۔

دُودھ والے میاں کی تنکھا ملی ہے۔" پھر اس تنخواہ میں سے وہ بھی اپنی تنخواہ لینے گئیں، جو پتا نہیں انہوں نے ایک روپیا مقرر کی تھی کہ دو روپے۔

مریم کا خرچ کچھ بھی نہیں تھا۔ باسودے میں ان کے مرحوم شوہر کی تھوڑی سی زمین تھی جو ممدو کے گزارے کے لیے بہت تھی اور بکریاں تھیں جن کی دیکھ بھال ممدو کرتا تھا۔ بڑا لڑکا شناب خاں ریلوائی میں چوکیدار تھا اور مزے کرتا تھا۔ برسوں کسی کو پتا نہ چلا کہ مریم اپنی تنخواہوں کا کرتی کیا ہیں۔ پھر ایک دن وہ ڈھیر سارے کل دار روپے میلے کچیلے نوٹ اور ریزگاری اُٹھائے ہوئے ابا کے پاس پہنچیں اور انکشاف کیا کہ وہ حج کرنے جا رہی ہیں۔ کرائے کی یہ رقم ان کی برسوں کی کمائی تھی۔ یہ مکہ مدینہ فنڈ تھا جو مریم خبر نہیں کب سے جمع کر رہی تھیں۔ ابا نے گن کر بتایا کہ نو سینکڑے تین بیسی سات روپے کچھ آنے ہیں۔ مریم کو اس سے غرض نہیں تھی کہ یہ کتنے ہیں، وہ تو سیدھی سی بات پوچھ رہی تھیں کہ ان سے مکے مدینے کا ٹکس مل جائے گا یا نہیں۔ ابا نے بتایا کہ بے شک مل جائیگا۔

مریم نے تیاریاں شروع کر دیں۔ وہ اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے گنگناتی رہتیں کہ کھوا جہ پیا جرا کھولو کوڑیاں۔ اُن پر مکے مدینے کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھی اور اُن کھڑکیوں سے نبیؐ جی کے مقدس پیراہن کی خوشبو چلی آ رہی تھی۔ کسی نے چھیڑنے کو کہہ دیا کہ تم کو ڈھنگ سے نماز پڑھنی تو آتی نہیں، قرآن شریف تو یاد نہیں ہے، پھر حج کیسے کرو گی؟

مریم بپھر گئیں "رے مسلمان کی بیٹا، مسلمان کی جورو ہوں۔ نماج پڑھنا کاہے نئیں آتی۔ رے کلمہ سریپ سن لے، چاروں کُل سن لے اور کیا چیئے تیرے کو؟" ہاں اور کیا چیئے تیرے کو؟ پھر اُن کے دل میں تو نبیؐ جی کے پیار کا چمن بھی کھلا ہُوا تھا کہ یہی بہت تھا۔

مگر ایک دن شتاب خاں کا خط آیا کہ ممدو کی حالت خراب ہے، بکریاں بیچ باچ کے علاج معالجہ کرایا، زمین گروی رکھ دی۔ اب بالکل پیسے نہیں ہیں۔ صورت دیکھنا چاہتی ہے تو خط کو تار سمجھنا۔ مریم کی آنکھوں میں مکہ مدینہ دھندلا گیا۔ انہوں نے نو سینکڑے تین بیسی سات روپے چادر میں باندھے اور روتی پیٹتی باسودے کی بس میں جا بیٹھیں۔ ابا ساتھ جانا چاہتے تھے انہیں سختی سے منع کر دیا۔

ممدو تو اُن کی ذمّے داری تھا، وہ کسی اور کو اُس میں کیوں شریک کرتیں۔ مریم کا یہ اصول بڑا سفاک تھا۔ انہوں نے باسودے سے خیریت سے پہنچنے کا خط تو لکھوا دیا پر ممدو کے بارے میں ایک لفظ نہیں لکھوایا۔ مہینے گزر گئے۔ کسی نے بتایا کہ وہ ممدو کو علاج کے لیے اندور لے گئی ہیں، پھر پتا چلا کہ بمبئی میں صابو صدّیق کی سرائے میں نظر آئی تھیں، پھر پتا چلا کہ ممدو مر گیا ہے۔ پھر ایک لٹی لٹائی مریم گھر لوٹ آئیں۔

میں اسکول سے گھر پہنچا تو دیکھا کہ مریم صحن میں بیٹھی اپنے مرے ہوئے بیٹے کو کوس رہی ہیں "رے حرامی! تیرا ستیا ناس جائے رے ممدو! تیری مٹھّری نکلے۔ اورے بد جناور تیری کبر میں کیڑے پڑیں۔ میرے سبرے پیسے کھرچ کرا دیے رے ری دُلھین! میں مکّے مدینے کیسے جاؤں گی۔ بتا ری دُلھین! اب کیسے جاؤں گی؟"

ابّا نے کہا "میں تمہیں حج کراؤں گا۔"

امّاں نے کہا "انا بوا، ہم اپنے جہیز والے کڑے بیچ دیں گے، تمہیں حج کرائیں گے۔"

مگر مریم چپ نہ ہوئیں، دو دن تک روتی رہیں اور ممدو کو کوستی پیٹتی رہیں۔ لوگوں نے سمجھایا کہ آخر دولھے میاں بھی تو تمہارا ہی بیٹا ہے، وہ اگر تمہیں حج کراتا ہے تو ٹھیک ہے، مان کیوں نہیں جاتیں؟ مگر مریم تو بس احسان کرنا جانتی تھیں،

کسی بیٹے کا بھی احسان اپنے سر کیوں لیتیں۔ انہوں نے تو اپنی کمائی کے پیسوں سے حج کرنے کی ٹھانی تھی۔

ممدو کے مرنے کے بعد مریم شاید ایک دفعہ اور باسودے گئیں اپنی زمین کا نیا پانچا کرنے پھر اس کے بعد باسودے کا زوال شروع ہو گیا۔ مریم کے چوڑے چکلے میواتی سینے میں بس ایک ہی شہر بسا رہ گیا۔ اُن کے حجورُ کا سہر۔ وہ اُٹھتے بیٹھتے " نبی جی، حجورُ جی" کرتی رہتیں۔ کبھی تو یوں لگتا کہ انہیں قرار سا آ گیا ہے۔ شاید اس لیے کہ اُن کے بھولے بھالے منصوبہ کار ذہن نے ایک نیا مکّہ مدینہ فنڈ کھول لیا تھا۔

ابّا نے بڑے شوق سے لحاف سلوا کر دیا، مریم چپکے سے جا کر بیچ آئیں۔ عید آئی مریم کے بھی کپڑے بنے، خدا معلوم کب، کتنے پیسوں میں وہ کپڑے بیچ دیے۔ ابّا امّاں سمیت، ہم سب کو جو ایک ایک آنہ عیدی دیتی تھیں، فوری طور پر بند کر دی۔ پیسا پیسا کر کے پھر مکّہ مدینہ فنڈ جمع ہو رہا تھا۔ سب ملا کر ابھی پانچ سو ساٹھ روپے ہی جمع ہوئے تھے کہ مریم کا بلاوا آ گیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ کب اور کس طرح چل بسیں۔ میں گرمیوں کی چھٹیوں میں اپنی خالہ کے گاؤں گیا ہوا تھا واپس آیا تو مجھے دیکھ کر امّاں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ " منجھلے! تیری انّا بُوا گزر گئیں۔ لڑکے تجھے بگاڑنے والی گزر گئیں۔"

ابّا نے مجھے حکم دیا کہ میں مریم کی قبر پر ہو آؤں، میں نہیں گیا۔ میں کیوں جاتا، ٹھنڈی مٹّی کے ڈھیر کا نام تو مریم نہیں تھا۔ میں نہیں گیا۔ ابّا ناراض بھی ہوئے مگر میں نہیں گیا۔

لوگوں نے بتایا کہ مریم نے مرتے وقت دو وصیتیں کی تھیں۔ ایک وصیت تو یہ تھی کہ تجہیز و تکفین اُنھی کے پیسوں سے کی جائے اور باقی کے پیسے شتاب خاں

کو بھیج دیے جائیں۔ دوسری وصیّت کا صرف امّاں کو علم تھا۔ امّاں کے کان میں انہوں نے مرتے وقت کچھ کہا تھا جو امّاں کسی کو بتانا نہیں چاہتی تھیں۔

میں یہاں آ گیا۔ پندرہ برس گزر گئے۔ ۱۹۶۵ء میں ابّا اور امّاں نے فریضۂ حج ادا کیا۔ امّاں حج کر کے لوٹیں تو بہت خوش تھیں، کہنے لگیں "منجھلے میاں! اللہ نے اپنے حبیبؐ کے صدقے میں حج کرا دیا۔ مدینے طیبّہ کی زیارت کرا دی اور تمہاری انّا بُوا کی دوسری وصیّت بھی پوری کرائی۔ عذاب ثواب جائے بڑی بی کے سر، میاں ہم نے تو ہرے بھرے گنبد کی طرف منہ کر کے کہئ دیا کہ یا رسول اللہ! باسودے والی مریم فوت ہو گئیں۔ مرتے وخت کہہ رئی تھیں کہ نبی جی سرکار ایں آتی ضرور مگر میرا ممدو بڑا حرامی نکلا۔ میرے سب پیسے خرچ کرا دیے۔"

مٹی دادا

بابا کے تین ناموں کی طرح مٹی دادا کے بھی تین نام تھے: مجینا — مجید اور مٹی دادا۔ مجینا کہنے والے اُن کے سامنے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مجید یا 'ارے ہاں مجید' کہنے والے دو تین بڑے بوڑھے اُن کے بعد بھی کچھ دن زندہ رہے۔ باقی تمام لوگوں کے لیے، سارے شہر، سب زمانوں کے لیے وہ مٹی دادا تھے۔

خود مٹی دادا کا بیان تھا کہ اُن کا اصل نام ' اَیڈل مزید کھاں ایشپ جئی' ہے۔ چنانچہ پولیس کے مشیر ناموں، راشن کارڈوں، سرکاری اسپتال کے کاغذوں اور آخر میں قبرستان کے رجسٹر میں اُن کا نام عبدالمجید خاں یوسف زئی لکھا گیا۔ اگر اُن کا کوئی وارث ہوتا تو لوحِ مزار پر بھی عبدالمجید خاں یوسف زئی ہی لکھا جاتا۔ اس لیے کہ اُن کی وصیت یہی تھی۔ مٹی دادا کے بارے میں محلے کے دھوبیوں نے اڑا رکھا تھا کہ وہ ذات کے ہندو تیلی ہیں اور ان کی مسلمانیاں تک نہیں ہوئی ہیں۔

دھوبیوں کی اس حرمزدگی کی وجہ خود مٹی دادا یہ بیان کرتے تھے کہ جوانی

میں دھوبیوں کے سلسلے میں اُن سے کچھ لغزشیں ہوئی تھیں اور یہ بدجناوروں کی اولاد اب ان باتوں کا انتقام لے رہی ہے۔

دھوبی محلّے میں اُن کی تگ و تاز کے بارے میں مجھے بس اتنا معلوم ہے کہ جوانی میں مٹی دادا دیکھنے دکھانے کی چیز تھے اور یہ کہ اُن کی آخری محبوبہ جمرت دھوبن سنہ ۶۵ میں ۷۰ سال کی ہو کر مری ہے۔

میں نے ڈبا کیمرے سے کھینچی ہوئی بادامی رنگ کی ایک بوسیدہ تصویر بھی دیکھی ہے جس میں اٹھارہ بیس برس کے مٹی دادا کان کی لَو تک پہنچی ہوئی لوہا چڑھی لاٹھی تھامے، تارا سی آنکھوں میں بہت سا سرمہ بھرے ایک زبردست پگڑ باندھے کیمرے کو گھورتے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔ مٹی دادا کی یہ تصویر مرحوم پھوپا ابّا کی کھینچی ہوئی ہے جنھوں نے شہر میں سب سے پہلے سنہ اٹھارہ سو کچھ میں بمبئی کی کسی پارسی فرم سے کیمرے کا وی پی پارسل منگوایا تھا۔ خاندان کے اسکینڈل باز بوڑھوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ مٹی دادا، پھوپا ابّا مرحوم اور اُن کے یاروں دوستوں کے لیے اغوا کی وارداتیں کیا کرتے تھے اور اربابِ نشاط سے رابطے قائم کراتے تھے۔ مگر یہ بڑی خباثت تھی، پھوپا ابّا کھرے پٹھان اور حافظِ قرآن تھے اور مٹی دادا تو تھے ہی یوسف زئی، ایسی گھٹیا باتیں اُن کے دائرۂ خیال میں بھی نہیں آسکتی تھیں۔ لوگ کہتے ہیں پھوپا ابّا نے انھیں ایک تپنچا خرید کر دیا تھا جسے چلانے کی نوبت تو شاید کبھی نہ آئی ہو مگر دھمکانے کے کام ضرور آتا تھا۔

میں نے اکثر مٹی دادا سے اس تپنچے کا ذکر سنا ہے۔ تقسیمِ ملک سے بہت پہلے کسی حرامی، اَزَل گِرہ پھناہان کے گھوڑے نے اسے چرا لیا اور دھوبیوں نے اڑا دیا کہ چرانے والے نے یہ تپنچا ٹین ڈبّے بھُوسی ٹکڑے والے کو خستہ

گجک کے بدلے میں تلوا دیا ہے۔ مٹی دادا تمنچے کے واقعے پر ہل کر رہ گئے تھے اور پولیس میں رپورٹ لکھانے چلے تھے مگر لوگوں نے سمجھایا کہ کیا غضب کرتے ہو، پولیس کو ہوا بھی نہ لگے، بلا لائسنس کا ہتھیار تھا اُلٹے چکر میں پڑ جاؤگے۔ مجبوری تھی۔ مٹی دادا خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ بعد میں کئی برس تک اس انتظار میں رہے کہ بس مجھے پتا چل جائے کہ میرا تمنچا کس سالے کے کنے ہے۔ آنتیں نکال کے اس اَزَل گَرپھتا بھان کے گھوڑے کے گلے میں پنا دُوں گا۔

آنتیں نکال کر گلے میں پہنا دینا ان کی پسندیدہ دھمکی تھی اور 'اجل گرفتہ' انھوں نے میرے چچا سے سنا تھا جو اس زمانے میں زور زور سے طلسم ہوشربا پڑھ کر ہم سب کو سنایا کرتے تھے۔

مٹی دادا کا خیال تھا کہ 'یہ یو' طلسم ہوشربا اور قصہ طوطا مینا اور انوار سہیلی وغیرہ ہیں یہ سب ٹھیک ہیں مگر انگریزی تعلیم جو ہے یہ آدمی کو 'نامرد' بنا دیتی ہے ـــــــ یہ لفظ وہ بزدل کے معنوں میں استعمال کرتے تھے۔ اور اکثر بڑے تاسّف سے کہا کرتے تھے کہ غضب خدا کا، جب سے ان پٹھان بچّوں نے انگریزی پڑھنا شروع کی ہے اس خاندان کے لوگوں نے کوئی 'کتل' ہی نہیں کیا۔

ایک بار ابا نے یہ بات سن لی اور انہیں ایسی ڈانٹ پلائی کہ سب سے چار دن تک روٹھے رہے، کسی سے بات نہیں کی۔ آخر پانچویں دن مجھے اشارے سے بلا کر رازدارانہ انداز میں کہنے لگے کہ تیرے باوا علی گڑھ جا کے خراب ہوئے ہیں پہلے ایسے نہیں تھے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ ہم نے ایک قاعدے کی بات کہی اور وہ بگڑ گئے 'بلا وَجے'۔

مگر یہ طے تھا کہ ابا کو اور ہم سب بہن بھائیوں کو اُن سے جتنی محبّت ملتی تھی، دوسروں کو اُس کی آدھی بھی نصیب نہیں تھی۔ ویسے مجموعی طور پر وہ پورے کُٹمب قبیلے کے عاشق تھے۔ مجھ سے کہتے تھے کہ میں تیرے کُٹمب قبیلے کے "ساکھ سجر" کا ماسٹر ہوں اور یہ کہ "ایسا چاروں کھونٹ ساکھ سجر" میں نے کہیں اور نہیں دیکھا۔

"ساکھ سجر" سے اُن کی مراد شجرۂ نسب ہوتی تھی مگر "چاروں کھونٹ ساکھ سجر" کیا ہوتا ہے، یہ نہ میں نے کبھی پوچھا نہ انہوں نے کبھی بتایا۔

اور میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ میرے کُٹمب کی حد تک میں دادا علمِ اسم نویسی کے ماہر تھے۔

اس مرحوم خاندان میں بڑوں کا طریقِ کار یہ تھا کہ جونہی لڑکا اپنا پورا نام لکھنے کے قابل ہُوا اس کا دادا، تایا، باپ یا چچا اُسے شجرۂ نسب کی ایک وصلی تھما دیتے تھے کہ لو بیٹا، سنبھال سنبھال کے اس کی سو نقلیں تو بنا دو۔ ظاہر ہے کہ کلک اور گاڑھی سیاہ روشنائی سے لمبے لمبے کاغذوں پر یہ شاخ شجر بنائے جاتے تھے۔ پنسل، فاؤنٹن پین، فولادی نب وغیرہ سے بزرگوں کے نام لکھنا سخت بے ادبی بلکہ مُدا خلت فی الدّین سمجھی جاتی تھی۔ اُنہیں درست طریقے سے بنانے میں مہینوں لگ جاتے تھے مگر یہ ایک طے شدہ طریقِ کار بلکہ پیدائشی جبر تھا جس سے بچنا ممکن نہیں تھا۔ شاخ شجر مکمل ہو جاتے تو خاندان کا اُس دور کا ہیٹری آرک، لمڈوں کو بُلا کر اُن کی کارکردگی ملاحظہ کرتا اور تمام کلمے، الحمد شریف اور چاروں قُل سننے کے بعد پہلے اُس لڑکے کی مین لائن پھر برانچ لائنیں زبانی سنتا اور ایک روپیا کلدار عطا کرتا تھا۔ درمیان میں بھول جانے کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اس لیے

کہ کئی مہینوں تک فلاں محمدّ خاں کے بیٹے فلاں محمدّ خان اور ان کے بیٹے فلاں محمدّ خاں خوابوں تک میں تلواریں لیے ٹہلتے پھرتے تھے۔ انہیں بھول کون سکتا تھا۔

دوسرے پیڑی آرکوں کے برخلاف میرے دادا الْمڈوں کی بدخطی کو نظر انداز فرماتے تھے مگر لمڈے بندہ بشر ہوتے ہیں۔ اگر غلطی سے اِن محمدّ خاں کے بیٹے اُن محمدّ خاں کی بجائے 'وہ دوسرے' محمدّ خاں لکھ دیا اور دادا کی نظر پڑ گئی تو سمجھو مارے گئے۔ انگلیوں پر کلک تقریباً توڑ دیے جاتے تھے کہ 'سؤر' میرے لکڑ سکڑ دادا کو ولدالحرام بتا رہا ہے! اُس وقت ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر اس قدر خفا ہونے کی کیا بات ہے، ہم درست کیے لیتے ہیں ـــــ مگر اب کچھ کچھ سمجھ میں آتا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ اُن سب کے یہاں یہ شدّت کس لیے تھی۔ شاید اپنی زاد بوم سے ہزار میل دُور اور سینکڑوں برس کے بُعد میں، یہ پشتون قبیلہ جو اپنی زبان بھی بُھول چکا تھا، کاغذوں پر اپنے نسب کے تحفّظ کی ہارتی ہوئی جنگ لڑ رہا تھا۔

اس لیے کہ لوگ کبھی کبھی شیخوں، مغلوں میں بھی شادیاں کر لیتے تھے اور بعضے تو اتنے بے ادب تھے کہ سیدوں تک کی بیٹی لے آتے تھے۔ معاذاللہ۔ آلِ رسولؐ سے خدمتیں لینا اور کبھی کبھی سخت سُست کہہ دینا! ـــــ اس بے ہودگی کا تصور ہی بدنوں میں لرزہ طاری کرنے کے لیے کافی تھا۔

تو دوسری اولادِ نرینہ کی طرح اس اذیت سے، کہ جو ہمارے یہاں ختنہ ہی کی طرح لازمی تھی، مجھے بھی گزرنا پڑا۔ عالمگیر بادشاہ کے عہد سے میرے ہوش سنبھالنے تک آٹھ پیڑھیاں بُھگتانا بہ ظاہر کوئی مشکل کام نہیں تھا مگر وہ سپاہی لوگ تھے اور پھر اُن زمانوں میں خاندانی منصوبہ بندی کا کوئی واضح تصوّر موجود نہیں تھا چنانچہ میں چیں بول گیا۔ مثلاً فلاں محمدّ خاں کے پانچ بیٹے،

ان پانچ بیٹوں کے مجموعی طور پر اٹھائیس اُنتیس بیٹے (جن میں بمشکل ایک دو لاولد) باقی ستائیس اٹھائیس کی اتنی اولادیں اور اُن کے اتنے اتنے نونہال.. اور معلوم ہوتا تھا ابھی ہم چار پیڑھی ہی اُترے ہیں کہ ایک وضاحتی شجرہ اور تھما دیا گیا کہ بیٹا ذرا اب ماؤں کی طرف سے ان چاروں پیڑھیوں کا حساب تو کرلو۔

اور یہاں سے ایک تہ دار عذاب مزید شروع ہوتا تھا اس لیے کہ کہیں خال خال انحراف کے سوا یہ خاندان آپس میں ہی شادیاں کرتا رہا تھا کیونکہ ہڈی اور خون کے تحفظ کا سوال تھا اور اس بات نے میرے لیے ایک عجیب صورتِ حال پیدا کر دی تھی۔ یعنی ایک رشتے سے جو صاحب میرے دادا یا نانا ہیں، وہ دوسرے حساب سے چچا اور تیسرے ذرا دُور کے رشتے سے ماموں ہوتے ہیں اور اس میں شک و شبہے کی کوئی گنجائش نہیں ـــــ کئی ہزار کاغذوں پر اسی طرح لکھا ہے اور اب جو یہ صاحب میری پھوپی کی صاحبزادی سے شادی کرنے پر تُلے ہیں تو یہ میرے بہنوئی بن جائیں گے اور ذیلی شاخ شجر، جَدول پانچ کے حساب سے دیکھو تو یہی صاحب میرے بھائی بنتے ہیں ہر چند کہ یہ رشتہ ذرا گھما کر ہے۔

اس عذاب سے گھبرا کر میں باقاعدہ رو پڑتا۔ تب ایسے میں مٹی دادا خدا کے بَروَقت فرشتوں کی طرح میری مدد کو آتے اور اسم نویسی کا مسئلہ پانی کر دیتے۔ گھنٹوں میرے پاس بیٹھ کر گتھیاں سُلجھاتے اور ہمّت بندھاتے۔

خود اُن کے شجرۂ نسب کے بارے میں سوال کرنے کا ہمیں خیال ہی نہیں آیا۔ یا آیا ہو گا تو دھوبیوں کی اُڑائی ہوئی افواہوں کے تناظر میں یہ سوچ کر کہ مٹی دادا اس بارے میں بہت حسّاس ہیں، ہم لڑکوں نے کبھی پوچھا نہیں

ہوگا۔ ایک بار کسی بزرگ خاتون نے خوش مزاجی سے پوچھ لیا کہ مجید تو سب کے شجرے یاد کیے بیٹھا ہے، خود اپنا شاخ شجر بھی یاد ہے تجھے؟ تو اُتنی ہی خوش مزاجی سے بولے" ہاں بیا۔ کیوں نہیں۔ سنو، سمسیر ابنے سمسیر ابنے سمسبیر ابنے اَبدُل مزید کھاں ایسُپ جنی" اور ایک زبردست قہقہہ مار کر ہنسے۔ نادر شاہ دُرّانی کا یہ تاریخی لطیفہ بھی اُنہیں چچا نے ہی سُنایا تھا۔

ہم لڑکوں کے لیے اُن کی جو حیثیت تھی، اگر اُسے کسی ایک دو لفظی اصطلاح میں بیان کیا جا سکتا تو وہ اصطلاح تھی "ماہر پشتو نباتات" کی۔ وہ ہمارے لیے "پٹھان ساگا" کے عالم تھے مثلاً یہ کہ پشتو زبان جو دنیا کی پرشکوہ زبانوں میں سے ایک ہے، کچھ اس طرح بولی جاتی ہے کہ دغا دار وڑا دا پستہ دا با دام روڑا دا ہینگ، اور یہ ہمیں بہت شاندار لگتا تھا کہ ہمارے پرکھا ایسی زبردست زبان بولتے ہوئے کفار کے علاقوں میں دَر آئے تھے اور انہوں نے سیاہ فام بھیلوں، کورکوؤں اور گونڈوں کے درمیان کھڑے ہو کر اعلائے کلمۃ اللہ کیا تھا اور یہ زبان بولی تھی۔ کیسا رعب پڑتا ہوگا مقامی آبادیوں پر!

اپنے ہم عمر کُنبے قبیلے والوں میں شاید میں سب سے زیادہ پُرتخیل واقع ہُوا تھا۔ آنکھیں پھاڑے، منہ کھولے مئی دادا کا بولا ہُوا ایک ایک لفظ پیتا رہتا۔ اور جب میری عمر کے دوسرے لڑکے پتنگیں اُڑانے اور ہاکیاں کھیلنے میں لگے ہوتے، میں باڑے کی کوٹھریوں والی چھت پر چڑھ جاتا اور اپنے قبیلے کے وطن تیراہ سے ہزار ڈیڑھ ہزار میل دُور، اپنے پشتون اَجداد سے ڈھائی تین سو سال پرے، ٹین کی نالی دار چھت پر لیٹا ہُوا قبائلی جنگیں لڑا کرتا یا بقول مئی دادا دَرّہ خیبر میں "ڈنڈم ڈنڈا اور تلوارم تلوارا" کیا کرتا۔

گرمیوں کی چھٹیوں میں میرا پسندیدہ کھیل یہ ہوتا تھا کہ میں کاٹھ کباڑ

والے تاریک کمروں میں گھس جانا، یا تل گھروں میں اُتر جانا یا دھاوؤں پر چڑھ جانا۔ اور کھیتی باڑی کے آلات میں دبے ہوئے زنگ خوردہ آدھے پون ہتھیاروں میں سے اپنے مطلب کی کوئی چیز نکال کر اُسے اپنے طور پر صیقل کرنا کبھی کوئی پوری تلوار، کٹار بھی مل جاتی جو زنگ سے نڈھال ہو کر ہل یا ہسیئے یا پاسے کی طرح بوجھل اور بے ڈول ہو گئی ہوتی تو اُسے دیکھ کر مجھے عجیب سا خیال آتا اور میں سوچتا کہ یہ تلوار جو اب ہل یا ہسیئے یا پاسے کی شکل ہو گئی ہے، یہ شاید ہمارا سپاہی پیشہ خاندان ہے اور اسے زمین پر پڑے پڑے ایک عدم استعمال، یا غلط استعمال نے کسان بنا دیا ہے۔ سو میں اپنے زنگ خوردہ سپاہی کو بحال کرنے کی کوشش میں بہن بھائیوں کے روبرو ناٹک کیا کرتا تھا۔ پردادا کی کامدار مخمل کی پھٹی ہوئی فرغل پہن کر، کمر سے آدھی پون تلوار باندھ کر میں پشتو مکالمات میں (جو ظاہر ہے متی دادا کی ایجاد ہوتے تھے) کفار کو للکارا کرتا، پشتو رجز پڑھا کرتا۔ متی دادا کو یہ ناٹک اور ہتھیاروں کی یہ بحالی بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ گھنٹوں ہم لوگوں کے ساتھ اس کھیل میں شریک رہتے کیونکہ اُن کا بیان تھا کہ وہ ہتھیاروں کے درمیان پیدا ہوئے تھے۔ ان کو ہر قسم کے ہتھیاروں سے عشق تھا۔

۴۷ - ۴۸ کے پُر آشوب زمانے میں پڑوس کی غیر مسلم ریاست سے مسلمان ہجرت کر کے ہمارے شہر آ رہے تھے، کیونکہ ہمارا شہر مسلمان اکثریت کا شہر تھا، شاید اب بھی ہو گا اور یہ پٹھانوں کی بسائی ہوئی ریاست تھی۔ متی دادا ایک روز ریلوے اسٹیشن سے گھیر گھار کے صیقل گروں، اسلحہ سازوں کا ایک خاندان لے آئے اور انہیں باڑے میں بٹھا کر ابا کی تلاش میں اسکول پہنچ گئے۔ پتا نہیں کس طرح ابا کو قائل کر لیا کہ بے چارے بے آسرا لوگ ہیں۔ جہاں چار کنبوں

کو باڑے کی کوٹھریوں میں پناہ دی ہے تو میاں ان کے لیے بھی جگہ نکالیے۔

پھر منی دادا نے بڑی کوشش اور سیاست سے اسلحہ سازوں صیقل گروں کے لیے ایک کوٹھری خالی کرائی، لکڑی کے کھوکھے لا لا کر تختے نکالے اور جگہ کر، باڑے میں ایک چھوٹا سا کمپاؤنڈ بنا دیا۔ اسلحہ سازوں، صیقل گروں نے دوسرے ہی دن گڑھا کھود کر دھونکنی نصب کر دی اور کھٹا کھٹ چھریاں تلواریں بنانی شروع کر دیں۔ پہلا زنبیہ منی دادا کے لئے تخلیق ہوا جس کے نیام پر اماں کی پرانی مخملیں صدری سے حاصل کیا ہوا کپڑا مڑھا گیا اور مرحوم تپنچے کے بعد منی دادا ایک اصل نسل زنبیے کے مالک بن گئے۔ تپنچے کی گمشدگی اور زنبیے کے حصول کے درمیان کی عذاب ناک مدت کے بارے میں پہلی بار منی دادا تقریباً مسکرا کر کہنے لگے۔ ''یہ تو تپنچا غایب ہوا ہے تو اس میں بھی مالک کی کوئی نہ کوئی مصلحت ہوئے گی۔ کیا پتا ہیں گھٹے میں کسی بھان کے گھوڑے کے پیٹ میں جھونک دیتا' بلاوجہ لینے کے دینے پڑ جاتے۔ پُلس کچہری ہوتی پھرتی۔'' کسی نے خدشہ ظاہر کیا کہ منی دادا تپنچا لے لینے اور زنبیہ دے دینے میں مالک کی کیا مصلحت ہو سکتی ہے۔ اب آپ کسی گھوڑے کے پیٹ میں زنبیہ اتار دیں گے۔ تو زور سے ہنسے اور زنبیے کے مخملیں نیام کو تھپکنے لگے، ''یہ کیا کھوجی سمجھ لیا ہے۔''

رتن ناتھ سرشار کے خوجی سے میرے چچا نے اور سروانٹے کے ڈون کیہوٹے سے میں نے متعارف کرایا تھا۔ مگر کیہوٹے اُن کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہتے تھے ''گورے سب ــــ تیا ہوتے ہیں۔''

یہی زمانہ تھا کہ ریاستی حکومت نے آتشیں اسلحہ اور چند انچ سے زیادہ پھل کے ہر دھار دار آلے کے لائسنسوں کی سختی سے پڑتال شروع کر دی۔ نئے لائسنس جاری ہو رہے تھے مگر بڑی سفارشوں کے بعد اور لائسنس

کی سالانہ فیس بھی ہوتی تھی جو بڑی رجیادتی، کی بات تھی مگر پہلا مسئلہ لائسنس کا حصول تھا۔ منی دادا نے اماں کی خوشامد کر کرا کے ماموں سے سفارش کروائی۔ وہ پولیس میں کوئی توپ افسر تھے۔ اور منی دادا کا کام بن گیا۔ زنبیے کا بارہ آنے سالانہ کا لائسنس جاری ہو گیا۔ منی دادا کو یہ بارہ آنے ہمیشہ کھلتے رہے۔ مگر انہیں یہ اطمینان ہو گیا کہ اُن کا زنبیہ "اب کوئی بھان کی گھوڑی گورمنٹ" بھی نہیں چھین سکتی، دوسروں کا ذکر ہی کیا۔ اماں نے اور ماموں نے سفارش گزارنے سے پہلے منی دادا سے تقریباً حلف اٹھوا لیا تھا کہ وہ کسی کو اس زنبیے سے دھمکائیں گے نہیں۔ "ناہیں میاں، جیسی چاہے کسَم لے لو، ہیں کسی اَزل گر بھتیا بھان کے . . ."

منی دادا سال میں ایک بار خود اپنا لائسنس اور میرے ابا، تایاؤں، چچاؤں، پھوپاؤں، خالوؤں کے اور میری اماں کے نام کے بندوقوں، رائفلوں، تیغوں، تلواروں، خنجروں، کٹاروں، کرچوں کے لائسنس اکٹھے کرتے اور فیس بھرنے کے لیے لائن لگاتے۔ واپس آتے تو مردانہ ڈیوڑھی سے ہی بڑبڑانا شروع کر دیتے کہ غضب خدا کا، ایک زمانہ وہ دیکھا سُنا تھا کہ گدی نشین تو نہیں تھے مگر فلاں محمد خاں کے محل پے پانچ پانچ توپیں چڑھی رہتی تھیں" مزال نھی کوئی اَزل گر بھتیا بھان کا گھوڑا نجر بھی ڈال کے دیکھ سکتا" —— اور فلاں محمد خاں بھی اگرچہ گدی نشین نہیں تھے مگر" ون کے کِتنے سولھے سو تَرواریں تھیں" —— وہ وہ سروہیاں، تیغے، کھانڈے، کرچیں، زنبیے، کٹاریں، کُھکھریاں، پیش قبض تھے کہ رہے نام مالک کا۔

ابا کہتے تھے، مجید کو تو ریاست کے اسلحہ خانے کا داروغہ ہونا چاہیے تھا۔ ہتھیار دیکھ دیکھ کے اس کا خون بڑھتا رہتا۔ پھر حکومت نے حکم جاری کیا

کہ تمام ہتھیار سرکاری مال خانے میں جمع کرا دیے جائیں۔ منّی دادا نے ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ یہ خبر سُنی۔ دو روز تک مغلظات بکتے رہے۔ غصّہ ذرا ٹھنڈا ہُوا تو میرے دو تین بزرگوں کو اپنا ہمخیال کیا اور ابا کو مشورہ دیا کہ لائسنس والے ہتھیار بے شک جمع کرا دیے جائیں مگر کونوں کھدروں، تل گھروں میں، دھاووں پر اور دیواروں میں پُرکھوں کی جو امانتیں محفوظ ہیں اُن کا کہیں کوئی اندراج نہیں ہے سو اُن کو صیقل کرا کے تیار رکھا جائے۔ زمانہ خراب ہے۔ اور پٹھان بچے تو اچھے زمانے میں بھی تیار رہتے ہیں۔

ابا علی گیبربن تھے، اصول پرست آدمی تھے، انہیں حکومت کے واضح احکام کی خلاف ورزی کسی صورت منظور نہیں تھی۔ پھر اُن کا کہنا تھا کہ سو پچاس برس کے دفن کیے ہُوئے ہتھیار اب کھاد بن چکے ہوں گے پھر اس تردّد بے جا سے کیا حاصل؟ اس لیے اس معاملے کو یہیں ختم کر دیا جائے۔ منّی دادا بظاہر مایوس ہو کر بیٹھ رہے مگر ہم لڑکے دیکھ رہے تھے کہ اُن کے گرد و پیش اور ہمارے دوسرے دالانوں، دھاووں، تل گھروں، زینوں میں ایک پُراسرار سرگرمی جاری ہے جس کا ابا کو کوئی پتا نہیں۔

لائسنس دار اسلحہ جمع کر دیے گئے۔ دو تانگوں میں کٹمب قبیلے کے دو چار بڑے اور منّی دادا ہتھیار لاد کر پولیس کے مال خانے پہنچے اور رسیدیں کٹوا کر خالی ہاتھ گھر لوٹ آئے۔

میں اسکول سے آیا تو دیکھا کہ منّی دادا ڈیوڑھی میں دیوار سے ٹیک لگائے سر نہوڑائے اکڑوں بیٹھے ہیں۔ یوں لگتا تھا اپنے کسی خون کے رشتے کو مٹّی کے سپرد کر آئے ہیں۔ دُکھ اتنا گہرا اُتر گیا تھا کہ آج مغلّظات بھی نہیں سنا رہے تھے۔ پھر جو تین چار دن بعد میرے ایک تایا کے ہتھیار جمع کرانے

مال خانے گئے تو مٹی دادا لوٹ کر نہیں آئے۔

خبر آئی کہ انہیں گرفتار کر لیا گیا ہے، کوتوالی خاص کے لاک اپ میں بیٹھے ہوئے ہیں اور مُغلظات سے شغل ہے۔ ہاں ہاں کر کے تقریباً پورا قبیلہ دوڑ پڑا۔ مٹی دادا ویسے تو شاید ملازم تھے مگر میرزائی خیلوں کی ڈیوڑھیوں کے پروردہ تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ دوسرے قبیلے کے ہی سہی، پٹھان تھے — وردیوں کے نرغے میں انہیں اکیلا کیسے چھوڑا جا سکتا تھا۔

اماں تانگے میں بیٹھ ترنت اپنے پولیس بھتیا کے یہاں پہنچیں اور میز پر سرونا مار مار کر بھائی کو حکم دے دیا کہ ابھی اسی وقت مٹی دادا کو گھر آجانا چاہیے!

میاں — آج ہمارے پُشتینی اہلکار کو — ایک بوڑھے کو بند کر دیا ہے تم نے تو کل ہمارے بچوں کو باندھ لے جاؤ گے۔ پرکھوں نے کیا اسی لیے اپنی تلواروں سے جنگل کاٹ کاٹ کے یہ ریاست بسائی تھی۔ آئیں ؟ اُس روز میری اماں کا جلال دیدنی تھا۔ بولتی ہی چلی گئیں۔ غالبؔ کے شاگرد نواب یار محمّد خاں رفعتؔ کی پوتی تھیں۔ ایک جیّد نوابزادے کی فکر مندی، ایک توانا شاعر کی طلاقتِ لِسانی اپنے جوہر دکھا رہی تھی۔

ماموں کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا، "مگر منجھلی آپا پتا تو چلے کہ اُسے کیوں بند کیا گیا ہے — سُنیے تو — میں بھیجتا ہوں کسی کو — آپ اندر تو چلیے۔ کھانا تو کھا لیجیے۔" مگر اماں چٹان کی طرح اُن کی مردانہ بیٹھک میں جمی رہیں اور جلال کے عالم میں بیٹھی چھالیا کترتی رہیں۔ ماموں کا پورا گھر ایک ایک بسکٹ اور ایک ایک پیالی چائے پر صبر کیے انہیں گھیرے بیٹھا رہا۔ ماموں کو وردی پہن کر خود جانا پڑا۔

دو گھنٹے بعد مٹی دادا ہماری ڈیوڑھی میں بیٹھے تھے اور کوئی دو درجن

میرزائی خیلوں کو اپنی روداد سنا رہے تھے۔

'اجل گرفتہ' اور وہ دوسری بات ہٹا کر میں جو سمجھ سکا، وہ یہ تھا کہ جب وہ تایا کے ہتھیار جمع کرانے مال خانے پہنچے تو حوالدار سکھیا رام جو ذات کا تیلی ہے اور وردی پہننے کے باوجود کسی طرف سے سپاہی نظر نہیں آتا، اس دن مال خانے کا انچارج تھا۔ منی دادا اور سکھیا رام کی پہلی مشترکہ بدقسمتی یہی تھی کہ ڈیوٹی پر سکھیا رام تھا۔ اگر بیلا سنگھ ٹھاکر یا گلاب خاں حوالدار ڈیوٹی پر ہوتے تو وہ کچھ نہ ہوتا جو ہُوا۔

پہلے تو سکھیا نے ہنس کر ان کی طرف دیکھا۔ دوسری واضح حرمزدگیاں یہ کیں کہ انہیں بڑے میاں کہہ کر مخاطب کیا اور چپراسی کے اسٹول پر بیٹھنے کی دعوت دی۔ منی دادا ایک طرف کھڑے اُسے گھورتے رہے۔ آتش فشاں اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ اُس کی آخری اور ناقابلِ معافی بدمعاشی جس سے آتش فشاں کا ڈھکنا ایک 'بوم' کے ساتھ اُڑ گیا، یہ تھی کہ اُس تیلی کے بچے نے ہمارے ہتھیاروں میں سے ایک ہتھیار اُٹھا لیا اور بے نیازی سے بیڑی پیتے ہوئے اُس سے اپنی پنسل چھیلنے لگا۔

یہ نواب غوث محمّد خاں فتح جنگ بہادر کا پیش قبض تھا جس کا قبضہ سنگِ یشب کا تھا جس پر سنگ تراش نے پھول پتیوں کے نقش کچھ اس طرح اُبھارے تھے کہ لگتا تھا موم سے ڈھال کر نکالے گئے ہیں۔ پیش قبض کے ایک چوتھائی پھل پر سونے کے پانی سے خُلد آشیانی پُرکھ کا نام نامی درج تھا اور فارسی زبان میں خبر دی گئی تھی کہ یہ ہتھیار ایک ایرانی کاریگر نے بطورِ خاص نواب بہادر کے لیے تخلیق کیا ہے کہ جو زمین پر کھڑے ہو کر روبرو شیر کا شکار کیا کرتے ہیں۔

سو پہلی بات تو یہ کہ سُکھیا رام ذات کا تیلی تھا اور آخری بات یہ کہ بیڑی پیتے ہوئے نواب غوث بہادر جنّت مکانی کے پیش قبض سے پنسل چھیل رہا تھا۔

مٹی دادا نے 'ازل گر بھتا' یا 'بھان کے' کہہ کر جو ایک زنّاٹے کا تھپّڑ مارا تو حوالدار سُکھیا کی بیڑی اور پنسل دُور جا پڑی پھر اُنھوں نے اس تیلی کے پوتے کو اطّلاع دی کہ یہ شیر بچّوں کی میراث ہے — تیری ترکاری کاٹنے والی چُھری نہیں اور یہ تیرے ہاتھ لگنے سے تو نجس ہو ہی چکی تھی مگر میں نے صبر کیا اور اب جو تُو بھان کے گھوڑے اس سے پنسل چھیلتا ہے، اب تو میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا وغیرہ۔

ظاہر ہے اس کے بعد مٹی دادا کو کوتوالی خاص کے لاک اَپ میں منتقل کر دیا گیا۔

کوتوالی انچارج بڑے چکّر بس تھا۔ تین فیتوں والے ایک چھوٹے موٹے پولیس افسر کو جو سرکاری وردی میں ڈیوٹی پر تھا ایک سویلین نے زدوکوب کیا تھا اور سرکاری فرائض کی بجا آوری میں مزاحم ہوا تھا۔

مگر ریاست ابھی یونین میں ضم نہیں ہوئی تھی۔

ایک پٹھان نواب ابھی ماہی مراتب کے سائے میں ریاستی گدّی پر بیٹھا مقدور بھر فرمانروائی کرتا تھا اور ایک ہزار سے زائد مسجدوں کے ایکہزار سے زائد منبروں سے ابھی اُس کے نام کا خطبہ پڑھا جا رہا تھا کہ خَلَّدَ اللّٰہُ مُلکَہٗ وَسَلطَنَتَہٗ — ہرچند کہ ریاستی پرچم کا مستوُل ہاتھوں سے پھسلا جاتا تھا اور نئی دلّی میں بات چل پڑی تھی کہ ریاست ضم کر دی جائے گی۔

تو نوّاب کے خوشحال، نیم خوشحال، تعلیم یافتہ، نیم تعلیم یافتہ — اور

مہذب، نیم مہذب مگر با اثر کٹمب قبیلے کے معزّزین اور ذرا کم معزّز کئی سو پٹھان کوتوالی خاص کو گھیرے کھڑے تھے کہ اتنے میں ماموں پہنچ گئے۔ انہوں نے علیگڑھ سے نفسیات میں فاضل کی سند خواہ مخواہ تو نہیں لی تھی۔ دس بیس منٹ میں اپنے توپ عہدے کی دھونس دیے بغیر بڑے پیار سے اپنے اُس ماتحت افسر کو قائل کر لیا کہ یہ غنڈا گردی اور فوجداری سے زیادہ تاریخ کی بازی ہارتے ہوئے ایک غیرت مند قبیلے کی جھلاّہٹ اور مجروح اَنا کا مسئلہ ہے۔ کوتوالی انچارج ذات کا چوہان راجپوت تھا اور تلوار باندھنے والے ہارتے ہوئے ہاتھوں کی تکلیف کو شاید سمجھتا تھا۔ علاوہ ازیں ایک بیوقوف غیر سپاہی ہیڈ کانسٹیبل کی وجہ سے اپنے افسرانِ بالا کے لیے مزید مسائل پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔

حوالدار سُکھیا رام کو جواب طلبی کا پروانہ ملا کہ ہر گاہ ہمارے علم میں آیا ہے کہ تم نے ریاست سے متعلق نہایت بیش قیمت نادر اور تاریخی اہمیت کے حامل ایک ہتھیار کو کہ جو تمہاری تحویل میں وغیرہ وغیرہ۔ سُکھیا رام کو لائن حاضر کر دیا گیا۔

ابّا نے مٹی دادا کو آرام کرنے کے لیے، زمینوں پر بھیج دیا۔ یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ وہ ہر کس و ناکس کو حوالدار سُکھیا، سابق انچارج اسٹیٹ مال خانہ کے زوال کی داستان سناتے پھرتے تھے۔

مگر کسے معلوم تھا کہ مٹی دادا کا تقریباً زوال بھی ہم لڑکوں کو دیکھنا پڑے گا۔ ایک بات پر ابّا اُن سے سخت ناراض ہوئے، باڑے کی ایک کوٹھری خالی کرائی گئی اور مٹی دادا کو پہلی بار ہماری ڈیوڑھی سے کچھ دُور چھاؤنی چھانا پڑی۔

ہوا یوں کہ دادا کے انتقال کے بعد شاید پہلی بار ہماری ایک بہن قبیلے سے باہر بیاہی گئی۔ لڑکا اعلیٰ تعلیم یافتہ مگر سخت سویلین تھا کہ اُس کا تعلق

کسی بار نے دھاڑنے والے قبیلے سے نہیں تھا۔ شادی کے بعد، ہمارے یہاں کے دستور کے مطابق داماد کو لے جایا گیا کہ وہ مٹی دادا کو سلام کرے اور مٹی دادا اُسے دو روپے سلامی کے دیں۔ ظاہر ہے، وہ اس کے بزرگ تھے۔ کوئی بوڑھا ادھیڑ اُس وقت موجود نہیں تھا اس لیے ہم لڑکوں کو مقرر کیا گیا کہ داماد کو لے جا کر رسم پوری کرائیں۔ مٹی دادا علیل تھے، نئے داماد کو دیکھ کر مسکرائے، جیوٹ کر کے اُٹھ بیٹھے۔ ہم نے دائیں بائیں تکیے لگا دیے۔ سلام لے کر اُنھوں نے داماد کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ سلامی کے دو روپے عطا کیے اور پھر 'پشتو نیات' کی بساط پھیلا دی۔

ڈیڑھ دو گھنٹے تک نیا داماد منہ کھولے مٹی دادا کے انکشافات سُنتا رہا۔ 'ساکھ شجرہ' پر ایک سیر حاصل تبصرے کے بعد مٹی دادا نے داماد کو بتایا کہ یہ میرزائی خیل بڑے جیوٹ والے کُٹھب ہیں، خونخوار اتنے کہ 'مزال' ہے کوئی اُن کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے دیکھ لے اور یہ کہ جو چالیس بیالیس گھر اس محلّے میں ایک ساتھ چلے گئے ہیں، یہ ایک دوسرے سے مربوط ہیں، ہر گھر نے دوسرے گھر میں ایک کھڑکی اتنی بڑی نکال رکھی ہے کہ ایک سالم آدمی مع تلوار یا 'رفل'، کے گزر سکتا ہے۔ اگر محلّے کے اس سرے پر میرزائی خیلوں کے کسی گھر پر حملہ ہو تو 'دس منٹی' میں اِس سرے سے اُس سرے تک سَو سوا سو مسلح پٹھان بچّے صورتِ حال پر قابو پانے اور حملہ آور کو نہس نہس کرنے کے لیے جمع ہو سکتے ہیں۔ مثلاً سنہ فلاں میں فلاں محمّد خاں ایک ذرا سی بات پر نائب کوتوال کو مع اُس کے گھوڑے کے قتل کر دینے کے بعد کھڑکیوں کھڑکیوں، گھروں گھروں گزرتے ہوئے صاف نکل گئے تھے، تو یہ فائدہ ہے ان مربوط مکانوں کا۔ پھر اس طرح عزیز پیاروں میں آپس میں

میل محبت بھی رہتی ہے۔ اس کی مثال مٹی دادا نے یوں دی کہ یہ جو اپنے بچھو میاں بیٹھے ہیں تو ان کے فلانے پر دادے نے انھی کے فلانے پر نانے کو صرف اتنی سی بات پر قتل کر دیا تھا کہ دونوں ایک جگہ ولیمہ کھانے گئے تھے۔ پردادے پہلے سے موجود تھے کہ پرنانے آئے۔ دونوں میں جائیداد پر معمولی سا مقدمہ چل رہا تھا (ویسے کوئی خاص بات نہیں تھی ان لوگوں میں نالشیں، فوجداریاں ہوتی ہی رہتی تھیں، ڈنڈم ڈنڈا، تلوارم تلوارا بھی چلتی رہتی تھی، کس لیے کہ شیر بچے ہیں آخر کچھ نہ کچھ تو کریں گے ہی) تو ان کے پرنانے جب ولیمے کی فرشی نشست پر جانے کے لیے پاپوشیں اتارنے لگے تو ان کی ایک پاپوش اِن کے اُس پردادے کی پاپوش پر چڑھ گئی کہ جو پہلے سے موجود تھا اور نووارد بُزرگ کی حرکات و سکنات کا بغور مشاہدہ کر رہا تھا۔ پاپوش کا پاپوش پر چڑھنا تھا کہ ان کا پہلے والا بزرگ چیک اُٹھا اور خبردار کہہ کر تلوار کا جو بھرپور ہاتھ مارا ہے تو دوسرے بزرگ کی گردن بھٹا سی دُور جا پڑی۔

داماد کے چہرے سے پسینہ بہہ بہہ کر شادی کی نئی شیروانی کے کالر میں جذب ہوتا جا رہا تھا۔ وہ دو تین بار پانی پی چکا تھا اور حد درجہ بے چین تھا۔ دیر بھی بہت ہو گئی تھی ہم اُسے زنانے میں لے آئے۔

دوسرے دن طوفان پھٹ پڑا۔ مٹی دادا بیمار تھے اُن سے تو ابا نے کچھ نہیں کہا، اماں کے سامنے گرجتے برستے رہے کہ کیا مجید کا بالکل ہی دماغ خراب ہو گیا ہے۔ داماد کو اس قدر دہلا دیا کہ وہ گھر جا کر گم صُم لیٹ گیا۔ لڑکی سے پوچھتا تھا کہ کیا یہ سب باتیں صحیح ہیں؟ اور کیا تم قاتلوں خونخواروں کی اولاد ہو؟ کیا تمہارے یہاں بات بات پر تلوارم تلوارا ہوتی ہے؟ پوچھ رہا تھا، تمہارے گھر میں اب کتنی تلواریں ہیں؟ اور کیا سب لوگ اب بھی ویسے

کی دعوتوں میں تلواریں باندھ کر جاتے ہیں تاکہ ایک دوسرے کو قتل کرنے میں آسانی ہو؟ حد ہو گئی، آخر یہ گڑے مُردے اکھاڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ ہر گھرانے میں کچھ نہ کچھ پاگل پن ہوتا ہی رہتا ہے۔ تو کیا اُس کو اس طرح مشتہر کیا جاتا ہے؟ لاحول ولا قوۃ۔

ہفتے بھر بعد باڑے میں ایک کوٹھری تیار کر دی گئی اور متی دادا کو وہاں فروکش ہونا پڑا۔

ڈیوڑھی سے دوران کی بیماری نے شدّت اختیار کر لی۔ ویسے تو انہیں ہم سب گھیرے رہتے تھے مگر وہاں اُن کا دل نہیں لگتا تھا۔ انہیں پتا چل گیا تھا کہ داماد والے معاملے میں منجھلے میاں خفا ہو گئے ہیں اور اسی لیے اُن کو ڈیوڑھی سے دور کر دیا گیا ہے۔ بڑی حسرت ناکی باڑے پر اور اس کے گرد و پیش چھائی ہوئی تھی۔ ایک روز کہنے لگے "اب مزید کھاں ایسپ جبیٔ جمین کا بوجھا بنتا جا رہا ہے۔ چل چلاؤ کا ٹیم ہے۔" وہ ابا کو بلوا کر اپنی صفائی پیش کرنا چاہتے تھے۔ میں نے جا عرض کیا کہ متی دادا بہت بیمار ہیں، آ کر دیکھ لیجیے۔ ابا آئے تو جیسے متی دادا کھل اُٹھے۔ حکیموں ویدوں کے "ونکھسوں" پر باتیں کرتے رہے —— 'اول گر پھنا' اور 'بھان کے' وغیرہ بھی شروع ہو گیا۔ پھر اچانک بڑی چمکدار آواز میں، جیسے ابا کو کوئی لطیفہ سنا رہے ہوں، کہنے لگے کہ منجھلے میاں، وہ داماد والے معاملے میں آپ خفا ہو گئے، شاید اسی لیے مجھے یہاں پھنکوا دیا۔ ابا نے کچھ ہُوں ہاں کر دی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ متی دادا کی بیماری سے، اُن کی حسرت ناکی، اُن کے لطیفہ سنانے کے انداز سے، جو ظاہر ہے، ابا کو راضی کرنے کی بڑی رقت انگیز کوشش تھی، وہ بہت متاثر ہوئے ہیں۔ متی دادا کہنے لگے "میاں، ویسے تو آپ ماسے اللہ بال بچّے والے ہو، برے میرے آگو کے بچّے

ہو۔ میری مُصلے تیں آپ نہیں سمجھ سکتے۔ یہ یوں کہتے ہیں ناکہ داکُڑ باکُسنن دا روجے اُوّل، تو میں نے صاحب جادے کو کھبر دار کر دیا ہے کہ ہاں کھبر دار پٹھانوں سے مالا ہے۔ ــــ اب صاحب جادے جیادہ کچھ چپس پٹاکھ نہیں کریں گے انسا اللّا۔

ابا نے اسی دن مٹی دادا کی ڈیوڑھی میں بحالی کے احکام صادر کر دیے۔ تو جیسے سُوکھے دھانوں پانی پڑ گیا۔ مٹی دادا کی حالت بہتر ہونے لگی مگر وہ بہت بوڑھے ہو گئے تھے زیادہ دن چلتے نظر نہیں آتے تھے۔ اماں نے ان کی محبوبہ جُمرت کو اُن کی دیکھ بھال کی اجازت دے دی۔ وہ آ کر منہ دھلاتی، کپڑے بدلواتی، اپنے ہاتھ سے دلیا کھلاتی، پرچ میں انڈیل انڈیل کر چائے پلاتی۔ مہینوں یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ابا نے ڈاکٹروں کو دکھایا، کئی طرح کے علاج بدلوائے مگر مٹی دادا پھر سنبھل نہ سکے گرتے ہی چلے گئے۔ اُن کا آدھا بستر سمیٹ دیا گیا۔ چارپائی کی بان دو طرف سے کھینچ کر درمیان میں ایک خلا بنا دیا گیا اور اُس کے نیچے تام چینی کا تسلا رکھ دیا گیا۔ حوائجِ ضروری کے لیے وہ اب بستر سے اٹھنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ جُمرت نے اُن کی صفائی ستھرائی کی سب ذمہ داری سنبھال لی تھی مگر وہ کنبے دار عورت تھی، رات میں نہیں رُک سکتی تھی۔ راتوں میں، میں دیکھتا کہ ابا گرم پانی کے لوٹے لیے کئی کئی بار ڈیوڑھی کی طرف جاتے اور کئی بار کمزور سی آواز میں مٹی دادا کے احتجاج کرنے اور رونے کی آواز آتی۔ وہ ابا سے خدمتیں نہیں لینا چاہتے تھے۔ اماں نے اُن کی دیکھ بھال کے لیے اپنے میکے سے کوئی ملازم بلوانے کو کہا تو مٹی دادا نے سختی سے منع کر دیا۔ میرے ابا اُن کے سامنے کے بچے تھے، بیٹوں کی طرح تھے۔ تو بیٹوں کی بات تو ٹھیک ہے " میں گیروں کے سامنے ڈھکا کھُلا نہیں ہو سکتا۔ وِس سے تو اچھا ہے مجھے اسپتال پہنچا دیو بیا،" مگر سب

جانتے تھے، وہ اسپتال میں دو گھنٹے بھی نہیں نکال سکیں گے۔ ختم ہو جائیں گے۔ انہوں نے اعلان کر دیا تھا کہ میں اس گھر میں مرنا چاہتا ہوں۔ وہ کئی کئی گھنٹے غشی کی حالت میں پڑے رہتے۔ دِن میں جمرت اور ہم لڑکے، رات میں ابّا، امرکان بھر اُن کو آرام پہنچانے کی کوشش کرتے تھے۔ مگر سب تھک چکے تھے۔

اور اس تھکن اور بوکھلاہٹ میں جمرت کو مٹی دادا کی ایک واضح ہدایت کا خیال نہیں رہا۔ وہ غشی کی حالت میں تھے کہ میں نے انہیں "ڈھکا کھُلا" دیکھ لیا — میں نے دیکھا کہ اُن کی مسلمانیاں نہیں ہوئی تھیں۔

اپنے چھوٹے سے ذہن میں بہت سے سوالات لیے میں خاموشی کے ساتھ ڈیوڑھی سے چلا آیا۔ اس نئی اور عجیب بات کی سنسناہٹ مجھے چین نہیں لینے دینی تھی۔ چھت پر گیا، باڑے میں ٹہلا، اماں کے پاس بیٹھا بہت دیر آنڈے بانڈے گھومتا پھرا۔ مگر مٹی دادا بہت بیمار تھے اور وہ ہم سب سے بہت محبت کرتے تھے۔ میں پھر ڈیوڑھی میں پہنچ گیا۔

میں نے سنا، اُن کے ٹھہر ٹھہر کر غصّہ کرنے اور رونے کی کمزور سی آواز آ رہی تھی۔ جمرت نے شاید انہیں بتا دیا تھا کہ کیا غضب ہو گیا ہے۔

"بھان کی گھوڑی مرتے مرتے کالک لگوا دی تو نے.... لڑکے کیا سوچیں گے؟" پھر اُن کے رونے کی آواز آئی۔ کچھ دیر خاموشی رہی "ٹھی ی ی ی ک ہے تیلی کا لمڈا پٹھانوں کے پالے سے پٹھان تو نہیں بن جاتا۔"

میں اب ڈیوڑھی میں نہیں رہ سکتا تھا۔ پھر باڑے کی طرف نکل گیا۔

تو کیا مٹی دادا ساری زندگی ہم سے جھوٹ بولتے رہے ہے؟ تو کیا محلے کے دھوبی ٹھیک کہتے تھے؟ ایسا لگ رہا تھا جیسے شکر کا نام لے کر کسی نے مجھے مٹھی بھر ریت پکڑا دی ہے مگر یہ بات میں کسی سے کہہ بھی تو نہیں سکتا تھا۔

وہ چار دن اور زندہ رہے مگر یہ چار دن غشی اور بیداری کی بھول بھلیاں تھے۔

اُن کے انتقال کے کئی مہینے بعد وہ ایک سوال جو اُس سنسنا ہٹوں والے دن سے برابر میرے ساتھ تھا، مجھے بے چین کیے ہوئے تھا، میں نے یکبارگی ابّا کے سامنے رکھ دیا۔ ابّا مسجد جانے کے لیے ڈیوڑھی سے گزر رہے تھے کہ متّی دادا کی کوٹھری کے سامنے مجھے خاموش کھڑے دیکھ کر رُک گئے۔ آہستہ سے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا، بولے "کیا بات ہے؟"

میں نے بات بتا دی۔

وہ بہت دیر خاموش کھڑے رہے۔ پھر آہستہ سے بولے، "وہ کوئی بھی تھے تمھیں بس ایک بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہ تم سے محبت کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ تم اپنے دادوں پردادوں کی طرح عزّت کے ساتھ جینا سیکھ جاؤ — سمجھے؟ جاؤ اب کھیلو۔"

پھر وہ جاتے جاتے غصّے سے پلٹ پڑے، "اور سنو، کون خبیث کہتا ہے وہ مسلمان نہیں تھے! کون کہتا ہے پٹھان نہیں تھے!"

گھر

میں اپنی سلامتی کے خوف سے گھر سے باہر نہیں نکلتا۔ میں گھر ہی میں رہنا چاہتا ہوں۔

اس لیے کہ باہر میلے چیکٹ تہبندوں والے دلاوروں کے رتھ دوڑ رہے ہیں۔ اُن کے ہاتھوں میں شوخ رنگوں والے ایبونائٹ کے نیزے ہیں جو دُور سے پلاسٹک کے کھلونے دکھائی پڑتے ہیں اور بظاہر بے ضرر لگتے ہیں مگر میں ان کی ضرر رسانی کا عینی شاہد ہوں۔ انہوں نے ایک نیزہ میرے بھائی کی بائیں آنکھ میں اُتار دیا ہے جو اس کے کاسۂ سر کو توڑ کر سر کی پشت پر نکل آیا ہے اور بہت بدصورت دکھائی دیتا ہے۔ سروں میں اس طرح نیزے کُھب جائیں تو لوگ ٹوپیاں کس طرح اوڑھ سکتے ہیں اور لوگ سو کس طرح سکتے ہیں۔ سو اُس دن کے بعد سے میرا بھائی ننگے سر گھومنے پر مجبور ہے۔

میں نے اُس سے کہا بھی تھا کہ باہر مت نکلنا مگر نوجوانوں کو گھروں میں بند نہیں رکھا جا سکتا، وہ اِس کُتیا زندگی کو چھو کر دیکھنا چاہتے ہیں اور نیزوں کی زد پر آ جاتے ہیں اور ننگے سر ہو جاتے ہیں۔

میں تو ایک دفعہ کے بعد گھر سے باہر نہیں نکلا۔ مجھے ضرورت ہی نہیں پڑی۔ اس لیے کہ میرا یہ گھر ایک مکمّل گھر ہے۔ میں چاہوں تو اس گھر کی خود کفالت میں کئی سو برس رہ سکتا ہُوں اور مجھے یہاں سے کوئی نہیں نکال سکتا۔

میرا یہ گھر پہلے پہل برگد کے ایک چھتنار درخت کے سائے میں بنایا گیا ہوگا مگر رفتہ رفتہ یہ گھر پھیل کر پہلے برگد کے گرداگرد بنتا رہا پھر برگد سے اُونچا نکل گیا اور اب برگد کی سب سے اُونچی ٹہنیوں سے، جہاں دوپہروں میں ہریل اور بینائیں پناہ لیتی ہیں، میرے گھر کی سیڑھیاں شروع ہوتی ہیں۔ دراصل برگد کا یہ درخت مکان کے فرش میں دفن ہو گیا ہے۔ کبھی کبھی بڑا دُکھ ہوتا ہے کہ ہم نے ایک زندہ چیز کو اپنی مسہریوں، چارپائیوں، تپائیوں اور سلفچیوں کے نیچے دفن کر رکھا ہے اور ہم اس پر چل پھر رہے ہیں، تہبند بدل رہے ہیں، کھانس رہے ہیں اور دھما چوکڑی مچا رہے ہیں۔

میں اپنی نوعمری اور ناتجربہ کاری میں اس زندہ برگد کو پتّھر سے تراشا ہُوا یا پینٹل میں ڈھالا ہُوا برگد سمجھتا تھا اور کبھی کبھی السائی ہوئی دوپہروں میں جب دور سے چکّی کی گُھمر گُھمر اور مُرغوں کی جیسے جماہیاں لے لے کر بانگیں دینے کی آوازیں آتی تھیں اور میں انہیں سُن سُن کر اونگھنے لگتا تھا تو بڑی کاہلی کے ساتھ سوچتا تھا کہ یہ جو فرش سے کھنکار کر گلا صاف کرنے کی آواز آتی ہے اور یہ جو کوئی ہتھیار ڈالتی ہوئی آواز میں تا ۱۱۱۱ نا' نا' ہُو وو کہہ کر چپ ہو جاتا ہے یہ برگد کی آواز نہیں ہو سکتی اور اگر یہ برگد کی آواز ہے تو وہ برگد ایک گونجتا ہُوا کھوکھلا ٹیوب ہے جو فرش کے نیچے دُور تک اُترا ہُوا ہے۔

خوب جچھپاتے ہوئے پینٹل کے اس کھوکھلے تنے میں سے یہ چار ماترائیں تا ۱۱۱۱' نا' نا' ہُو وو ایسے گزر رہی ہیں جیسے ایئر کنڈیشننگ کے نمدہ لپٹے ہُوئے

ڈکٹس سے ٹھنڈی خوشبودار ہوا گزر رہی ہو۔ مجھے یہ خیال بھی نہیں ہوتا تھا کہ یہ
ایک ٹھوس، گیلے اور زندہ برگد کی آواز ہوسکتی ہے جس نے اپنی ثمدار جٹائیں
زمین میں گاڑ رکھی ہیں اور جس نے بے شمار ہریلوں اور میناؤں کو پناہ دے رکھی
ہے، اور جسے میرے گھر کی تعمیرات نے ہوا اور دھوپ سے محروم کر دیا ہے۔

بہت دنوں تک مجھے یہ بھی وہم رہا کہ ہوا اور دھوپ تہبندوں کو سکھانے
کے لیے فراہم کی جاتی ہے اور برگدوں اور ہریلوں اور میناؤں کو ان کی ضرورت
نہیں ہوتی۔

مجھے پہلے دن سے یہی بتایا جاتا رہا تھا کہ میں دلاوروں میں سے ہوں
اور نیزے اور تہبند میری بنیادی ضرورتیں ہیں اور ہوا اور دھوپ اور ندی
ہمارے تہبند اور نیزے دھونے اور انہیں سکھانے میں کام آتی ہیں اور ہمارے
پاس قہرِ خداوندی کی طرح سبک رفتار رتھ ہیں۔

یہ اُس وقت کی بات ہے جب میں ایک بار بھی گھر سے باہر نہیں نکلا
تھا — اور میں ایک دفعہ کے بعد گھر سے باہر نہیں نکلا۔ میں باہر کس لیے
نکلوں؟ میرے گھر میں، گھر کے گرداگرد بڑی دل موہ لینے والی چیزیں ہیں۔
گھر کے پچھواڑے کی باڑ سے ملے ہوئے بانسوں اور سرکنڈوں کے چھدرے چھدرے
جُھنڈ ہیں جن سے بچتی بچاتی پاترا ندی بہتی ہے۔ نقشہ نویسوں نے اسے
کوئی نمبر دے رکھا ہے اور وہ اسے نالہ بارانی شمالاً جنوباً نمبری فلاں فلاں
کہتے ہیں اور اپنی بے خبری میں اسے بہت مسکین جانتے ہیں مگر چار پانچ
دن لگاتار ایک ہی رفتار سے ننھی ننھی سوئیوں جیسی پھوار بھی پڑتی رہے تو
یہ پاترا ندی اپنی بانہیں اور جانگھیں پھیلا دیتی ہے اور آس پاس کے کھیتوں
کو اپنی خواہش کا نشانہ بناتی ہے اور انہیں اپنی کاہل تیل چپڑی، آہستہ رو

شہوت میں لتھیڑ دیتی ہے اور مجھے بڑی شرم آتی ہے جب میں اُس کی بغلوں سے اور بیڑو سے جھانکتے ہوئے سرکنڈے اور بانسوں کے گیلے جھنڈ دیکھتا ہُوں، یوں لگتا ہے جیسے اپنے کسی محرم کو، جس سے کوئی جنسی ربط ممکن نہ ہو، برہنہ ستر دیکھ لیا ہو۔ تب میں، جو اُس کا وُسنز اُس کا ستر پوش ہُوں، میں اپنی پلکیں گرا کر اُس کی ستر پوشی کرنا چاہتا ہوں — اُسے محفوظ دیکھنا چاہتا ہُوں پر ساون بھادوں میں جہاں تک نظر ڈالو، یہ بھاری اسنتوں والی ابلا، کالی مٹی پر اپنی کایا کا بوجھ ڈالے آلس کے ساتھ کروٹیں بدلتی دکھائی دیتی ہے اور بڑی غیر محفوظ لگتی ہے اور میں سوچتا ہوں کہ اُسے کون سمیٹ سکتا ہے کہاں تک سمیٹ سکتا ہے۔

ننّھی سوئیوں جیسی پھوار کہر کی دبیز چادر کی طرح دوسرے کنارے کے جانے پہچانے نشانوں کو ڈھانپ لیتی ہے اور ندی کا پاٹ کئی میل کا دکھائی پڑتا ہے۔ گہری دُھند میں ندی کے پار سے آوازیں کچھ اس طرح آتی ہیں جیسے یگوں کے پار سے آرہی ہوں۔ تب ایسے میں، مَیں ندی میں اُتر جاتا ہوں اور کندھوں تک پانی میں ڈوبا ہُوا ان آوازوں میں لپٹی ہُوئی ایک خاص آواز کو ڈھونڈتا ہوں جو پکار کر کہتی ہے کہ ہے پاتزا، ہے پتّریا، ہے ویشیا، ہے کلنکنی پھر یہی آواز ہچکیاں لے لے کر روتی بھی ہے۔

پتا نہیں کون بوڑھا بدمعاش ہے، جو ننّھی ننّھی سوئیوں کی ٹھنڈی دُھند کے پار کھڑا ہوا ندی کو بُرے بُرے نام دے رہا ہے۔ میں کسی روز اسے گدّی سے پکڑ کر اُس کا منہ کیچڑ میں دے دوں گا۔

ایک روز میں نے چیخ کر کہا بھی تھا کہ او بڈّھے سُوَر، بکواس بند کر! اور مارے غصّے کے پانی ہی میں کھڑے کھڑے میرا پیشاب خطا ہو گیا تھا۔

یہ ایسی پریشانی کی بات تھی کہ میں ندی سے نکل کر سیدھا اپنے گھر بھاگ آیا اور بہت دنوں تک پانی کے پاس نہیں گیا۔ بس گھر میں بیٹھا رہا اور برگد کی چار مانترائیں سنتا رہا کہ تا اااا، نا، نا، ھُو وو۔

میں نے شاید ابھی تک نہیں بتایا کہ یہ آخری مانترا "ھُو" ھُو ووو م م م کی طرح گونجتی ہے اور اس میں کسی اچھی کمپوزیشن میں گھٹتے وائیولن کے کاؤنٹرز تک سنائی دیتے ہیں، کبھی کبھی پینل کی ایک گھنٹی بھی ٹائم دیتی ہے۔ اس ھُو وو و م م م کے آخری نوٹس، نوٹس نہیں ہوتے۔ وہ جھٹپٹے کے وقت کی طرح غیر یقینی سرحدوں میں گُم ہو جاتے ہیں۔ یہ شاید ایکو کی وجہ سے ہو مگر مجموعی تاثر ایکو سے زیادہ گمشدگی کا تاثر ہوتا ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ ایک دفن کیا ہُوا برگد اپنی ایک مانترا میں اتنی بہت سی باتیں رکھتا ہے مگر ان باتوں کا پتا مجھے رفتہ رفتہ ہوا ہے۔ میں نے بتایا تھا کہ شروع میں تو میں اس زندہ برگد کو پتھر میں تراشا ہُوا یا پینل میں ڈھالا ہُوا ایک ڈمب برگد سمجھتا تھا اور اپنی ندی کو نقشہ نویسوں کی طرح نالہ بارانی شمالاً جنوباً کہتا تھا اور باڑے کے دروازے سے ملحق پرانی گھاس کے ڈھیر پر اُکڑوں بیٹھی ہُوئی، بنا بیلوں کی بیل گاڑی کو محض لکڑی اور بانسوں سے بنایا ہُوا ڈیک ڈمبر سمجھتا تھا۔

دراصل چیزیں، اِدھر سے اُدھر پہنچنے کا عمل بڑی آہستگی سے پُورا کرتی ہیں۔ اکثر اوقات تو ہمیں پتا ہی نہیں چلتا۔ جب کھال کے نیچے یا پلکوں کے پیچھے آنکھوں کے ڈھیلوں پر یا ہیڑ ڈ میں یا میڈولا اوبلانگیٹا کے آس پاس گرے میٹر میں یا متروک ہو جانے والی دُم کی ہڈّی میں وہ چُبھتی ہیں تو اُن کی موجودگی کا یقین آجاتا ہے اور بڑی حیرت ہوتی ہے۔ اب اس اکڑوں بیٹھی ہُوئی بیل گاڑی ہی کو لو، پتا نہیں کب سے وہاں تھی پر میں نے اُس

کی موجودگی کو اپنی بائیں آنکھ کے ڈھیلے پر اُس دن محسوس کیا جس دن لوگوں
نے آکر بتایا کہ گھر سے دُور میلے چیکٹ تہبندوں والے دلاوروں نے میرے بھائی
کی آنکھ میں ایبو نائٹ کا شوخ رنگ نیزہ اتار دیا ہے اور وہ اب ننگے سر گھوم
رہا ہے۔ یُوں کہ نیزے کھُب جائیں تو لوگ ٹوپیاں کس طرح اوڑھ سکتے ہیں
اور لوگ سو کس طرح سکتے ہیں۔

اور کوئی رو بھی تو نہیں سکتا کہ رونے کے لیے ایک نظام کی ضرورت ہوتی
ہے کہ تہبند پہن کر اور شطرنجیاں بچھا کر اور اگر دانوں میں عُود اور لوبان جلا
کر رویا جاتا ہے جس کے لیے کافی اور وافر منطقی جواز کی ضرورت ہوتی ہے
ورنہ لوگ گُدّی سے پکڑ کر کیچڑ میں منہ دے دیتے ہیں۔ اس لیے ندی کے لیے
نہیں رویا جا سکتا اور گھاس کے ڈھیر پر اکڑوں بیٹھی بنا بیلوں کی بیل گاڑی
کے لیے نہیں رویا جا سکتا اور برگد کے لیے دُکھنے کا کوئی جواز نہیں اور مینائیں
اور ہر بل وہ ڈمب پرندے ہیں جنہیں سب دائیں اور بائیں ہلاک کرتے ہیں
اور خدا کی سب خوبصورت اور کمزور چیزوں کے لیے تمام تہبند کھلے ہوئے
ہیں اور ایبونائٹ کے نیزے تُلے ہوئے ہیں اور قہرِ خداوندی کے برق رفتار
رتھوں پر دلاوروں کے دل عقاب ہیں۔

پر میں تو رونا بھی چاہتا ہوں کہ میں اپنے خدا کا ایک سہما ہُوا کبوتر ہوں۔
اسی لیے میں نے اپنے گھر کے عین وسط میں صندل کا ایک بھاری صندوق
رکھوا دیا ہے جس کے پٹ پر خوبصورت خطِ کوفی میں خدا کا اسم ذات اور اُس
کے تمام اسمائے حسنیٰ کھُدے ہوئے ہیں اور جب میں رتھوں کے پہیوں کی
دلوں کو دو نیم کر دینے والی چرچراہٹیں سُنتا ہوں اور ہوا کو کاٹتے ہوئے ایبونائٹ
کی تیز سیٹیاں سُنتا ہوں اور تہبندوں کی پھڑ پھڑاہٹ میرے گھر اور باڑے

کے باہر گِدھوں کے پروں کی طرح تالیاں بجاتی ہوئی اُترتی ہے تو میں اس صندوق میں جا بیٹھتا ہوں اور اپنے اوپر اسمائے حسنیٰ کا پٹ ڈھک لیتا ہوں اور خدا کی تمام خوبصورت اور کمزور چیزوں کے لیے اور پورسلین کی چھوٹی چھوٹی طشتریوں اور پیالیوں کے لیے اور تمام ہیجڑوں اور بہت سی کتابوں کے لیے جن کے نسخے ناپید ہیں اور فاختاؤں، میناؤں اور ہریلیوں کے لیے اور رُکے ہوئے پانی پر واٹر اِس کی اِنگ کرتی ہوئی جل مکڑیوں کے لیے اور سفید، نیلے اور گلابی کنول کے لیے اور گوری شنکر شرما کے لیے جو اسپتال کی عمارت تعمیر کرتے ہوئے کھڑے کھڑے گر کر مر گیا تھا اور پیپل کے برگد کے لیے اور پاترا ندی کے لئے اور بنا بیلوں کی بیل گاڑی کے لیے اور اپنی بیٹیوں کی تمام گڑیوں کے لیے اور ٹوبیوں کے لیے اور ایک بوسیدہ کمبل اور شیونگ کا سامان رکھنے والی مراد آبادی ڈبیا کے لیے اور تین ریڈی میڈ فراکوں کے لیے اور محمود ہاشمی کے لیے اور گہرے سُرخ رنگ کی ایک کشمیری شال کے لیے اور لوہے کی ایک گھڑونچی کے لیے اور بہت سے ناتواں لوگوں کے لیے اپنے خدا سے مہلت طلب کرتا ہوں اور میرا خدا مجھے یہ مہلت دے دیتا ہے اور میں صندوق سے باہر آجاتا ہوں اور تھوں کی چرچراہٹوں اور ایبونائٹ کی سیٹیوں اور تہبندوں کی پھڑپھڑاہٹوں کو دم توڑتے ہوئے سنتا ہوں۔ پھر فرش سے کھنکار کر گلا صاف کرنے کی آواز آتی ہے اور پہلی بار ایک للک ایک ترنگ کے ساتھ جیسے فرش کو توڑتی ہوئی چار ماترائیں اُمگتی ہیں کہ نا ا ا ا ا نا' نا' ھُو وو اور آخری مانرا ھُو وو دم م م کہتی ہوئی اپنے کاؤنٹرز اور اپنی پیتل والی گھنٹی کے ٹائم کے ساتھ وائبریشن کی ایک غیر واضح سرحد پھلانگتی ہوئی پتا نہیں کب اپنا سفر مکمل کرتی ہے کہ شاید کبھی نہیں کرتی — لرزش کا ایک نہ ایک ریشمی دھاگا سماعت سے اُلجھا ہوا رہ ہی جاتا ہے کہ

"سا" کے سُر میں پھر ایک بار پہلی ماترا پھر دوسری تیسری اور چوتھی ماترائیں فرش سے پھوٹتی ہیں۔ اور پھوٹتی رہتی ہیں اور میں شرابور ہو جاتا ہوں۔
اور اب میں کسی کتیا زندگی کو چھُو کر نہیں دیکھنا چاہتا۔ اس اپنے گھر میں رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے یہاں سے کوئی نہیں نکال سکتا۔

ترلوچن

جو کچھ ہُوا اس سے پہلے یہاں انسانی بستیاں موجود تھیں اور جانور، درخت، دریا اور پہاڑ سبھی تھے۔ ایک تواتر کے ساتھ موسم آتے رہتے تھے۔ چیزیں اُگتی تھیں، بڑھتی، پھیلتی اور پُرانی ہوتی تھیں اور رسان سے مر جایا کرتی تھیں کبھی کبھی کوئی قہقہہ مار کر ہنس بھی دیا کرتا تھا۔ مجموعی طور پر سب ٹھیک ہی تھا۔ عین الحق یہ سب کچھ ختم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگر کوئی کُتّے کا مُوت اس کی پیٹی کھول کر چیزوں کی فہرست نہ چُرا لے جاتا جو اس نے اتنی دل سوزی سے تیار کی تھی تو عین الحق ہرگز ہرگز وہ نہ کرتا جو اُس نے کیا۔

اُس نے جو کچھ کیا وہ وقتی اشتعال اور مایوسی کے تحت کیا تھا مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے کہ اب تو کچھ تھا ہی نہیں جسے پھر سے ترتیب دیا جاتا۔ سب ختم ہو چکا تھا۔

اور جو کچھ ہوا، وہ پلک جھپکتے ہو گیا۔ پیٹی خالی دیکھ کر اُس نے اھلوک، پرلوک اور دیولوک تینوں کی ڈوریاں اپنی انگشتِ شہادت پر لپیٹ کر مٹھّی بند کی، ایک ذرا کندھا جُھکا کر جھٹکے سے انہیں اپنی پُشت پہ لیا، سیدھے ہاتھ

کی مٹھی پر مٹھی کس کر اللہ اللہ کہا اور ہوا میں جیسے کدال چلاتے ہوئے تینوں لوک زمین پر دے مارے۔

یہاں تک بھی ٹھیک تھا، بات کچھ زیادہ بگڑی نہیں تھی۔ لیکن اس کے بعد تو عین الحق نے غضب ہی کر دیا۔ وہ پورے قامت سے تن کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے جھٹکے سے اسٹکنگ پلاسٹر کا وہ ٹکڑا اپنی پیشانی سے نوچ پھینکا جسے وہ پابندی سے نماز کے گٹے والی جگہ پر چپکا لیا کرتا تھا۔ پھر اُس نے سر جھکایا، زمین کی طرف دیکھا اور تمام و کمال قہاری میں اپنی تیسری آنکھ کھول دی اور تینوں لوک جلا کر خاک کر دیے۔

سو اب دھوئیں اور راکھ کے سوا کچھ نہیں تھا جسے پھر سے ترتیب دیا جاتا۔ سب ختم ہو چکا تھا اور عین الحق جانتا تھا کہ دھوئیں اور راکھ کو ترتیب نہیں دیا جا سکتا۔ یہ خاتمہ ہے۔

یہ سب ایک بلی سے شروع ہوا تھا۔ ایک دن گلی سے گزرتے ہوئے اُس نے اچانک اُس بلی کو دیکھا اور اُسے فہرست بنانے کا خیال آ گیا۔ وہ بلی اس قدر زخمی اتنی میلی اور جگہ جگہ سے اتنی نچی کھچی تھی کہ ساری باتیں کاغذ پر لکھے بغیر یاد نہیں رکھی جا سکتی تھیں۔ اُس نے سوچا، فہرست بنانا اچھا رہے گا۔ وہ اب تک چیزوں کو اپنے ذہن میں محفوظ رکھتا آ رہا تھا۔ لیکن چیزیں اتنی بہت سی ہو گئی تھیں اور برابر بڑھتی جا رہی تھیں اور اُن کی تفصیل اتنی طولانی ہوتی جا رہی تھی کہ اب ذہن میں محفوظ رکھنا ممکن نہیں رہا تھا۔ وہ ڈرتا تھا کہ کہیں بھولنا شروع نہ کر دے اس لیے اُس نے ایک بڑے کاغذ پر سات سو چھیاسی لکھا اور نمبر شمار اور نام اشیا اور اُن کے کوائف اور کار ہائے مجوزہ اور تاریخِ عملدرآمد کے خانے بنائے اور اُن خانوں میں اُس نے سب چیزیں درج کرنا شروع کر دیں۔ تاریخ

عملدرآمد کا خانہ ابھی خالی رکھا اس لیے کہ پہلے وہ چیزوں کو اور اُن کی تفصیل کو حافظے سے کاغذ پر منتقل کر لینا چاہتا تھا۔ یہ بہت ضروری تھا۔ باقی عملدرآمد میں دیر ہی کتنی لگتی۔ فہرست مکمل ہونے کے بعد وہ کسی بھی دن اور کسی بھی وقت کارہائے مُجَوِّزہ کے خانے میں لکھی ہوئی باتوں پر عملدرآمد کر کے معاملے نمٹا سکتا تھا۔

تو اُس نے سب سے پہلے نمبر شمار ایک پر بلّی کو درج کیا اور اُس کے کوائف لکھے اور کارہائے مُجَوِّزہ میں درج کیا کہ اُسے نئی کھال وغیرہ دینی ہے اور تاریخ عملدرآمد کا خانہ خالی چھوڑ دیا۔ دوسرے نمبر پر عین الحق نے ہیڈ کانسٹیبل لطافت میر خاں کی بیوہ رقیہ بیگم کا مسئلہ درج کیا، وہ اسی بلاک کے ایک لاولد مکان میں تنہا رہتی تھی، اسے عرق النسا کی شکایت تھی اور دُکھ اور تنہائی میں اُس کا چہرہ لٹک گیا تھا۔ یہاں کارہائے مُجَوِّزہ کے خانے میں اُس نے طے کیا کہ رقیہ بیگم کو عرق النسا سے چھٹکارا دینا ہے اور ایک لے پالک کے بیٹے بیٹیوں سے اُس گھر کا صحن آباد کرنا ہے۔ رقیہ بیگم کے بعد اُس نے بھورے خاں کولڈ ڈرنک اینڈ سگریٹ کارنر کو درج کیا جو بہتّر برس کا منحکا ماندہ امرد پرست تھا، اس کا گھر بار نہیں تھا، دکان کے تھڑے پر ہی سو رہتا تھا۔ اُسے خوبصورت لڑکوں کو دکان پر بٹھانے اور اسلامی تاریخی ناول پڑھوا کر سننے کا شوق تھا۔ پریشانی کی بات یہ تھی کہ لڑکے بھاگ جاتے تھے اور وہ انہیں یاد کر کر کے روتا تھا اور فتح برموک کتنے ہی دن ملتوی رہتی تھی عین الحق نے بھورے خاں کولڈ ڈرنک اینڈ سگریٹ کارنر کو درج کیا اور اُس کے کوائف لکھے اور کارہائے مُجَوِّزہ میں لکھا کہ ایک خوبصورت اور باوفا لڑکا ہمہ وقت موجود رہے تاکہ بھورے خاں جدائی اور دکھ میں دہرا نہ ہو جائے اس لیے کہ بہتّر برس بہت ہوتے ہیں۔ پھر اُس نے ہزارے سے آئے ہوئے شیر زمان موچی اور اُس کے نیک نفس

بھابیوں کو درج کیا جو فجر سے پہلے اُٹھ کر شبیر زمان کی چارپائی پہ اکڑوں بیٹھ جاتے تھے اور اُس سے اٹک اٹک کر قرآن پڑھا کرتے تھے۔ اُن سب کی بیویاں ملک میں تھیں اور وہ دن بھر شبیر زمان کی ہدایت کے مطابق جوتے گانٹھتے اور ٹیپ ریکارڈر پر سلطان میاں قوال کی قوالیاں سنتے تھے۔ عین الحق نے اُن کے کوائف لکھے اور کارہائے مجوّزہ میں درج کیا کہ ان سب کا ان کی بیویوں سے ملاپ کرانا ہے اور لکھا کہ شبیر زمان کی بواسیر خونی رفع کرنی ہے کیونکہ وہ بچوں اور قلیل آمدنی والے کمزور لوگوں سے بھی نرمی سے بات کرتا تھا۔ پھر عین الحق نے عقاب کے سے تجسس والی مائی نوراں مسّی کو درج کیا جس کے پنجے بھی عقاب کے تھے اور عین الحق نے اس کے کوائف لکھے اور کارہائے مجوّزہ میں لکھا کہ مائی نوراں مسّی کو نئی ریڑھ کی ہڈّی دینی ہے اور بلاک نمبر دو سے بلاک نمبر آٹھ تک مکانوں کی عقبی گلی میں وافر مقدار میں پلاسٹک کے ٹکڑے، ہڈّیاں اور ردی کا غذ مہیّا کرنا ہے جو عرصہ بارہ سال تک فراہم رہیں کس لیے کہ نوراں کا ناسور اسے اس سے زیادہ کی مہلت نہیں دے گا۔ عین الحق نے دفعِ ناسور از پنڈلی لکھ کر کاٹ دیا کیونکہ اس طرح بعض گھروں سے ملنے والا خصوصی بونس بند ہونے کا احتمال تھا اور یہ بات کسی عنوان بھی نوراں کے لیے مناسب نہ تھی۔ پھر بلاک نمبر دو سے بلاک نمبر آٹھ تک آتے ہوئے پارک سے متّصل مَدکامنی کے پیڑ کے نیچے پہنچ کر عین الحق نے دیکھا کہ تنور والے مَخا دُولا نے مَدکامنی کے نوعمر تنے سے اپنا مینڈھا باندھ باندھ کر اُس کی نرم چھال کو اُدھیڑ دیا ہے تو عین الحق نے اُدھڑی ہوئی چھال کے نم دائرے سے اپنی اُنگلیوں کے پور مَس کیے اور مَدکامنی کے پیڑ سے وعدہ کیا اور پیڑ کے کوائف درج کیے پھر کارہائے مجوّزہ میں لکھا کہ مَدکامنی کا زخم بھرنا ہے اور تالیفِ قلب

کے لیے نئی کونپلیں بھی دینی ہیں۔ پھر اُس نے پولی ٹکنک والے سہیل کو درج
کیا جسے بیرونِ ملک بھیجنا تھا اور عبدالقدیر قادری اور عترت حسین زیدی کو
درج کیا جنہیں ترقیاں دینی تھیں اور عین الحق کی مصروفیات بڑھتی چلی گئیں۔
اُس نے برتن قناتوں والے ننگے کو درج کیا جو گھر والی کی فحش بدعنوانیوں کے
سبب ڈھے گیا تھا اور پور پور سے ہلاک ہو رہا تھا تو عین الحق نے یہ لکھا کہ
اس بی بی کے نظام میں مناسب تبدیلیاں کرکے اُسے ننگے کی اطاعت میں بحال
کرنا ہے اور عین الحق نے موٹر سائیکل والے لڑکے کو درج کیا جو صبح و شام چکر
لگاتا تھا اور بلاک نمبر تین میں وہ بچی اُسے خاطر میں نہ لاتی تھی تو عین الحق نے
اسے اُداسی سے موٹر سائیکل پر چکر لگاتے دیکھا اور نرم سرگوشیوں میں وعدہ
کیا کہ سب انتظام کر دیا جائے گا اور اُس نے کمّو گانڈر کی بیمار مُرغی کو درج کیا
اور اس طرح چیزوں کی فہرست طولانی ہوتی چلی گئی۔
وہ چراغ جلے بیٹھتا تو کہیں رات ڈھلے دن بھر کے اندراجات مکمل کر
پاتا اور اب یہ ہونے لگا کہ دو نمبر یا تین نمبر بلاک سے آٹھ نمبر تک آتے آتے
کبھی ایک آدھ چیز بھول جاتا اور اُسے دوبارہ موقع پر پہنچ کے اندراج مکمل
کرنے پڑتے اور اسی جھنجٹ میں چار نمبر بلاک کی حمیرا کا ٹوکیمیا درج ہونے سے
رہ گیا۔
اور جب اس اندراج کی ضرورت نہ رہی تو بلاک نمبر چار کے اختتام پر
عین الحق ظاہر ہُوا۔
وہ سڑک کی طرف سے گلی میں مڑا اور اُس نے دیکھا کہ مسجدِ نور کا چھوٹا
والا گہوارہ پھولوں میں رکھا ہوا ہے۔ عین الحق پیلا پڑ گیا۔ اُس نے لرزتے کانپتے
ہُوئے دوپہر کے سنّاٹے سے پوچھا کہ کیا حمیرا؟ وہ گہوارے کے ساتھ ساتھ

رینگتا ہوا چھ نمبر بلاک تک گیا اور اُس نے دوپہر کے سناٹے سے پوچھا کہ کیا حمیرا؟
اور وہ چھ نمبر سے آٹھ نمبر بلاک کے سرے تک دوڑتا ہوا گیا اور خجالت کے آنسوؤں
میں بھیگتے ہوئے اُس نے گہوارے کا پایہ تھام لیا اور ساتھ ساتھ چلنے لگا اور ہولے
ہولے اپنی صفائی میں کہتا چلا کہ بی بی میں بھول گیا تھا! بٹیا میں بھول گیا تھا!
اماں میں بھول گیا تھا! اور آٹھ نمبر بلاک کی حد پر اُس نے گہوارے کا پایہ چھوڑ
دیا۔ پھر عین الحق نے ایک چیخ کی بازگشت میں بلاک نمبر دو کی طرف سَعی کی اور
پکارتا چلا کہ میں بھول گیا تھا! پھر باقی دن اور باقی رات وہ اسی چیخ کی بازگشت
میں رہا۔ وہ بلاک دو سے بلاک آٹھ تک اور بلاک آٹھ سے بلاک دو تک گونج
کی طرح سنسناتا رہا اور جو کچھ درج ہونے سے رہ گیا تھا دیوانہ وار اپنی یادداشت
میں محفوظ کرتا گیا۔ ایک ایک مکان پر سے گزرتے ہوئے اُس نے اپنے حافظے
میں سب چیزوں اور سب لوگوں کی حاجت مندیاں اور تمام چھوٹے بڑے دکھ
محفوظ کیے اور طے کیا کہ مُرغ کی بانگ سے پہلے انہیں فہرست میں درج کرے
گا اور جب مرغ بانگ دے رہے ہوں گے تو عملدرآمد کرے گا۔

ایک پہر رات باقی تھی کہ وہ اپنے کمرے پر آیا اور یہ دیکھا کہ کمرے کا تالا
ٹوٹا ہُوا ہے اور اُس کی پیٹی اوندھی پڑی ہے۔ کوئی کُتے کا مُوت اُس کی
فہرست چرا لے گیا تھا۔

پیٹی خالی دیکھ کر عین الحق نے حیرانی میں چھ طرفوں پر نظر ڈالی اور مایوسی
میں سر ہلایا اور گمان سے بالاتر ہُوا اور تب ہی عین الحق نے اہلوک، پرلوک
اور دیولوک تینوں کی ڈوریاں اپنی انگشتِ شہادت پر لپیٹ کر مٹھی بند کی
ایک ذرا کندھا جُھکا کر جھٹکے سے انہیں اپنی پشت پر لیا اور مٹھیاں کس کر
ہوا میں کدال چلاتے ہوئے تینوں لوک زمین پر دے مارے —— پھر وہ

پورے قامت سے تن کر کھڑا ہو گیا اور جھٹکے سے اپنی پیشانی کا پلاسٹر نوچ پھینکا۔
پھر عین الحق نے سر جھکا کر زمین کی طرف دیکھا اور تمام و کمال قہّاری میں اپنی
تیسری آنکھ کھول دی اور تینوں لوک جلا کر خاک کر دیے۔

براوو! براوو

پگڑی کی طرح اپنے سر سے ہرے ہرے نرم کانٹوں کا دائرہ لپیٹے، سوکھے بدن پر ارغوانی رنگ کا ٹاٹ اوڑھے، پیروں سے مُونجھ کی سینڈلیں باندھے، بالسا وڈ کی لمبی صلیب گھسیٹتا ہُوا اب جو وہ اپنے گھر سے نکلا ہے تو ایک ایک رفیق کے دروازے پر دستک دیتا چلا جائے گا کہ اے رفیق، السّلام علیکم اپنے مکان سے باہر آ اور اے جاننے والے، کچھ قدم میرے ساتھ چل اور اے ایلی پاک دامن، اے کشادہ دل رفیق، میری پیشانی کو بوسہ دے اور اے جانِ برادر، الوداع کہہ اور واویلا کر کہ میں اپنی صلیب اٹھائے اپنے مقتل کو جاتا ہوں۔

اس وقت صبح کے نو بجے ہوں گے۔

سو اُس کی آواز کے اسیر، اُس کے یہ چاروں ہمدم اُس کے ہمراہ ہولیں گے۔ وہ گریہ و زاری کرتا، نو بجے کی شاہراہوں سے گزرتا ہر چورستے ہیں ان رفیقوں کی پیشانیوں کو بوسے دے گا اور بغل گیر ہوتے وقت صحیح ٹائمنگ سے لڑکھڑائے گا۔ بازار میں پہنچ کر وہ ہر بقّال، ہر آہنگر، ہر جفت ساز کو دیکھ کر سینہ زنی کرے گا اور اُن کے لفظوں پر اعراب لگاتا آگے بڑھ جائے گا۔

صبح کے دس بجنے والے ہوں گے ....

کہ وہ شہیدوں کے چوک میں پہنچ کر دیو قامت کرونو گراف کے سامنے بیں دم لے گا اور ٹھیک دس بجے جب کہ کرونو گراف BEEPS سناتا ہو گا، وہ اپنی لنگوٹی سے شیشے کے ٹکڑے نکال کر منہ میں بھر لے گا۔ پھر اپنی شبیشہ چباتی ہوئی آواز میں پکارے گا کہ ہلاکت ہو، تم پر ہلاکت ہو۔ اے بے مہر ساعتو، اور واویلا مچے اُن اے ان ساعتوں میں زندہ رہنے والو تمہارے گھر بے چراغ ٹھہریں اور تمہارے تاکستانوں پر سُرخ چیونٹیوں کی یلغار ہو کہ وہ غول غول ہو کر آئیں اور تمہارے نخلستانوں کو بادِ سموم جھلس دے اور تمہارے گلے ریگستانی بھیڑیوں کی خوراک بنیں اور تمہاری گابھن اونٹنیوں کے پستان خزاں رسیدہ پتّوں کی مانند خم ہو جائیں۔

لفظ 'پستان' کو وہ شیشے کے ساتھ چبا چبا کر بڑی دیر تک منہ میں گھولتا رہے گا، پھر کہے گا کہ ہلاکت ہو اور تم پر واویلا مچے کہ میں، یوحنا ایلیاہ ــــ آنسوؤں سے بپتسمہ دینے والا، اپنی صلیب کے بوجھ سے کراہتا ہُوا آج اپنے مقتل کو جاتا ہوں۔

یہاں وہ کراہ کر دکھائے گا یا آہ بھرے گا، پھر کہے گا کہ

ہلاکت ہو، تم سب پر ہلاکت ہو کہ میرے آئندہ میں تم اپنا کوئی وجود نہیں رکھتے ــــ کہ آج کے بعد سے تم چوتھی ڈائمینشن میں زندہ رہو گے۔ واویلا ہو کہ آج تو میں تمہارے سوگ میں ہوں اور اے جاننے والے، میرے سر پر مٹھو ڑی خاک ڈال دے کہ میں تو ہر موجود کے سوگ میں ہوں۔ تب وہ جاننے والا جیب سے صندل کے بُرادے کا شیشہ نکال کر چٹکی بھر سفوف اُس کے سر پر چھڑکے گا اور کہے گا کہ یوحنا، خاک تو فنا بھی ہے اور نمو کا وعدہ بھی۔ اور وہ دو ہتڑ مار کر گریہ وزاری کرے گا۔ پھر نقلی صلیب والا کہے گا کہ اے الاسد، تُو دو کوہان

کے اونٹ کی طرح بخیل کیوں ہے؟ تیرے رفیق تیرا ماتم کریں، تو میری چھاتی سے لگ کر بین کیوں نہیں کرتا؟ اور اے ایلی پاک دامن اے فتنہ قامت میری پیشانی پر بوسے دینا بند کر دے کہ تیرے لعابِ دہن کی ٹھنڈک میرے غصے کی آگ کو کہیں بجھا نہ دے اور اے جانِ برادر، تو یہ گریہ وزاری لپیٹ ہی لے اور بہتر در یچوں والے گھر کو لوٹ جا کہ آج ہولناک داستانیں رقم ہونے کا دن ہے۔

سو جانِ برادر خوشی خوشی گھر کو لوٹ جائے گا۔

اس وقت دن کے بارہ بج چکے ہوں گے اور وہ سب کے سب سائے ہیں ٹھہر جائیں گے۔

(وہ لمبی صلیب والا اور اس کے تینوں رفیق سائے ہیں ٹھہر جائیں گے)

(وہ سائے ہیں ٹھہر جائیں گے)

دن کے بارہ بج چکے ہوں گے اور چوگرد گھومنے والی شعلہ زن تلوار کے کھدیڑے ہوئے گروہ کرونوگراف کے مہیب سائے سے بچتے کتراتے ہوئے گزر رہے ہوں گے۔ وہ اس کی صلیب کو چھو کر گزریں گے۔ مگر ان کے لیے اس کی آواز کی کمندیں کوتاہ ٹھہریں گی۔ وہ اسے ہونٹ ہلاتے اور جبڑوں کی ہڈیاں کٹکٹاتے ہوئے تو دیکھیں گے مگر اس کی آواز نہیں سن پائیں گے، سو بڑی بیزاری سے منہ پھیر کر اپنے مٹھی بھر جو سنبھالتے ہوئے تیزی سے گزر جائیں گے۔ ان کو تو یہ گمان بھی نہ ہوگا کہ لمبی صلیب والے کی بد دعائیں اور بشارتیں ان ہی کے لیے ہیں۔ ان کو جاننے کے اس عذاب سے پناہ ملے گی۔ مگر اس ایک عذاب کے سوا ان کے گروہ، پیٹ کی بھوک اور برہنگی اور شہوت کی چوگرد گھومنے والی شعلہ زن تلوار کے سب عذاب سہیں گے۔

تو پھر یوں ہوگا کہ لمبی صلیب والے کی ساری بد دعائیں اور تمام بشارتیں

بے ہدف، بومرونگ کی طرح ہوا میں سنسناتی اور سیٹیاں بجاتی واپس لوٹیں گی اور خود اُس پر اور اُن پر آن گریں گی جو اُس کے قریب سائے میں کھڑے ہوں گے۔

مگر وہ تینوں تو اُس کے رفیق ہوں گے۔ اُن میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہ ہو گا کہ اُس نقلی صلیب والے کی مُخبری کر دے اور اُس کو پکڑوا دے۔

ہر چند کہ وہ کفر پہنے ہو گا اور کفر بکتا ہو گا اور کفر سوچتا ہو گا۔

(وہ کفر سوچتا ہو گا۔)

اُس وقت وہ اپنی صلیب سے ٹیک لگائے، سر نیہوڑائے سائے میں کھڑا ہوا اپنے دل کی اُمنگ میں سوچتا ہو گا کہ ارے یہ تو سب کچھ ویسا ہی ہو رہا ہے جیسا کہ ناصرہ کے آسمان شکوہ نجّار کے ساتھ ہوا تھا۔ وہ اذیّت طلب، اپنے اس خواب کی سرشاری میں لرزتا ہو گا کہ دیکھنا! ابھی میرے ان ہی رفیقوں میں سے ایک اپنے سائے سے نکل کر اُدھر کو جائے گا جہاں صلیب پر چڑھانے والے کھڑے ہیں۔ وہ اُن کو بلا کر لائے گا اور تیسرا پہر شروع ہونے سے پہلے مجھے چار مضبوط کیلوں سے لکڑی پر ٹھونک دیا جائے گا۔ مگر اس سے پہلے شاید میرا رفیق ایلی پاک دامن تین بار میرے ہونے سے انکار کرے گا اور شاید میرا رفیق جاننے والا ایک سبز شاخ پر سرکے میں بھیگا ہوا اسفنج رکھ کر مجھے چُسائے گا اور شاید وہ میرا رفیق الآسد ہو گا جو میری مخبری کرے گا اور صلیب پر چڑھانے والوں کو بُلا کر لائے گا۔

"تو اے مخبر —— الآسد، میرے یہوداہ، تجھے جو کچھ کرنا ہے جلد کر لے!"

درشت لہجے اور کرخت چہرے والا الآسد اپنے خیال کی معصومیت میں بڑھ کر اُس کے ارغوانی ٹاٹ کو بوسہ دے گا اور کہے گا کہ یوحنا ایلیاہ۔ میں تیری باتیں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ میں خیال میں بھی تجھ سے دغا کرنے سے باز رہا تو پھر تُو مجھے

یہوّواہ کہہ کر کیوں پکارتا ہے؟

تسپہ نقلی صلیب والا جھڑکی کھائے ہوئے بچّے کی طرح ایک ایک رفیق کا چہرہ تکے گا اور سہمی ہوئی کمزور آواز میں پوچھے گا کہ کیا تم میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں کہ میری مُخبری کردے اور مجھے صلیب پر چڑھوا دے؟

وہ تینوں باری باری سر ہلا کر انکار کریں گے اور کہیں گے کہ نہیں یوحنّا ایلیاہ ہم تیری مخبری نہیں کرنے کے، یہ سن کر وہ دو ہتّڑ مارے گا اور ذبح ہوتی بھیڑ کی طرح آواز کرے گا پھر بین کرتا ہُوا عظیم چورستے کے ٹارمیک پر لوٹیں لگائے گا اور قابو میں نہیں آئے گا، ہر چند کہ جاننے والا روتا ہُوا اُس کے ساتھ ساتھ پھرے گا اور الاسد اُس کے چہرے پر سرد پانی کے چھینٹے مارے گا اور ایلی پاکدامن محبّت سے دلاسہ دے گا، پھر عاجز ہو کر بیٹھ رہے گا اور جماہیاں لے گا۔

اُس وقت سہ پہر کے تین بجے ہوں گے۔

تین بجے کی BEEPS سن کر حد درجہ نڈھال یوحنّا رینگتا ہُوا دوبارہ کروناگراف کے سائے میں چلا جائے گا۔ تیسرے پہر کی اداسی میں اُس کا کانٹوں کا تاج مسل مسلا کر بھوسا ہو چکا ہو گا۔ ٹاٹ کا لبادہ نالی میں اس طرح پڑا ہو گا کہ اُس کا کچّا ارغوانی رنگ گدلے پانی میں بدرنگ لکیریں بنا کر بہتا ہو گا اور بالسا وڈ سے تراشی ہوئی ہلکی صلیب، مٹھی مٹھی بھر جڑ لے جانے والوں کے پیروں تلے آکر لُگدی بن چکی ہو گی۔ بلاشبہ یوحنّا ایلیاہ، یسوع ناصری کے کاسٹیوم کے بغیر جس قدر ننگا ہو گا، اتنا تو وہ اپنے پیدا ہونے وقت بھی نہ تھا۔

تب سسکیاں لیتے ہوئے جاننے والا اُس کو اپنے مضبوط بازوؤں میں اُٹھا لے گا۔ الاسد اُس کے تاج کا بھوسا اور اُس کی صلیب کی لُگدی پولیتھلین کے ایک تھیلے میں بھر لے گا۔ ایلی پاکدامن نالی میں ہاتھ ڈال کر اُس کا ٹاٹ اٹھا لے گا،

اور ٹاٹ سے بدبودار پانی نچوڑتا ہوا سب کے پیچھے پیچھے چل پڑے گا۔

اور وہ لوگ، اُس کو، جو صبح کو مصلوب ہونے کی اُمنگ میں گھر سے نکلا تھا
شام ہوتے ہونے بہتّر دربچوں والے مکان کے ایک حجرے میں رکھ آئیں گے۔
(وہ اُسے اُس کے حجرے میں رکھ آئیں گے۔)
(اُسے حجرے میں رکھ آئیں گے)

"ایا درازا، ایاہ پہنا، ایاہ پیرفع، ایاہ بالا"[۱]

حجرے کی اُونچی چھت سے ٹکرا ٹکرا کر اُس کی آواز اُسی کے لاغر بدن پر کنکریوں کی طرح گر رہی ہو گی۔ وہ اپنی پسلیوں میں اپنی لانبی نوکدار انگلیاں گڑائے ہنکارتا ہو گا کہ تیرے سورج نے تو میرے ساتھ آج بھی دغا کی۔ میں تو خجالت کی گرد میں اَٹ گیا کہ یہ سُورج بھی رخصت ہُوا اور میں زندہ ہوں۔

تُو مجھے مرنے کیوں نہیں دیتا اور مجھے جینے کیوں نہیں دیتا۔ اے میرے دشمن۔ اے میرے دوست۔ مجھے جینے دے، مجھے مرنے دے۔ کہ میں جیتا رہوں تو تیرے جبال کا شعلۂ مستعجل میرے بدن سے ایندھن لیتا رہے اور مر جاؤں تو چٹان پر پھینکے ہوئے طشت کی طرح تیری صدیاں میری نزع کی چیخ سے جھنجھناتی رہیں کہ الوہی۔ الوہی۔ الوہی۔

تُو مجھے مرنے کیوں نہیں دیتا؟ اور بتاتا کیوں نہیں کہ کیا وہ میرا وہم تھا جو میں حوریب پر اُترا تھا اور اپنے الٰہہ کی لوحیں اٹھائے بستی میں پہنچا تھا جہاں سب کے سب سونے کے بچھڑے سے جُفتی کھاتے تھے اور مجھے اور میرے الٰہہ کو پہچانتے نہ تھے؟

تو کیا میں بار برداری کا جانور تھا کہ اُن حرامزادوں کی خاطر اپنی جان کو

۱۔ جون ایلیا کی طویل نظم "راموز" سے ایک سطر۔

عذاب دیتا رہا ؟
تو کیا میں غصہ بھی نہ کروں اور اپنے اللہ کی لوحوں کو زمین پر مار کر ٹکڑے ٹکڑے بھی نہ کردوں ؟
تو مجھے جینے کیوں نہیں دیتا ؟ میں تو خیال کی لطافت میں زندہ رہنا چاہتا تھا۔ مگر ہلاکت میرے ہونے پر کہ میں نسل کشی کے مہیب اعضا لے کر پیدا ہوا اور اپنے بدن میں رہنے پر مجبور ہوں۔
یہ تو نے کیسی زندگی میرا مقسوم کی ہے ؟ اور السر کی موت اور پیچش اور مینین جائیٹس کی موت میرے لیے کیوں بچا رکھی ہے ؟
ہلاکت ان آنکھوں پر کہ میں صحرا کی عذاب ناک راتوں میں گھر گیا اور بے نواب گریہ وزاری کی مشقتیں جھیلتا ہوں۔
واویلا، نورِ باطن پر کہ میں چوبِ خشک کی طرح جلتا ہوں اور مجھ سے حرارت اور روشنی لینے والا کوئی نہیں !
"کٹ۔ ! شاٹ اوکے ! کل دالائٹس۔ کل داساونڈ !! دکل ایوری تھنگ"

"کل ایوری تھنگ ! ایوری تھنگ !"
بعل زبوب کے بے شمار سائے تالیاں بجاتے ہوئے اُس کو اپنے گھیرے میں لے لیں گے اور اُس کے ساتھ ٹھٹھول کریں گے۔ وہ اس کے سر پر چھڑیاں ماریں گے اور اُس پر تھوکیں گے۔ وہ اپنے ساتھ نئی مے اور جَو کی روٹیاں لائے ہوں گے، سو وہ اسے اوندھا گرالیں گے اور اُس کے بدن میں روٹیاں داخل کریں گے اور مے کے شیشے اُس پر اُلٹ دیں گے اور اُسے حد درجہ ستائیں گے۔
وہ کھونٹی پر ٹنگے ہوئے شہید کی طرح سب کچھ سہتا رہے گا، کہ بدن کی اذیت

میں اُسے مزہ ملے گا اور اِن باتوں کی پبلسٹی وبلیو ہو گی۔

جب وہ زمین پر پڑا ہو گا تو بعل زبوب کے سائے اُس سے پوچھیں گے کہ تُو اُٹھ کر کوئی کام کیوں نہیں کرتا؟ اور جب وہ دیوار کے سہارے اُٹھ کھڑا ہو گا تو وہ سوال کریں گے کہ تُو جاتا کہاں ہے، آرام کیوں نہیں کرتا؟ اور وہ اُسے ٹھوکر مار کر گرا دیں گے۔ پھر اُن میں سے ایک یوں کہے گا کہ تُو تو حد درجہ نکما ہے، اُٹھ اور خداوند کی ہیکل میں جا اور ایک تپائی بچھا کر اپنے سکّے پھیلا دے اور کاروبار کر۔

پھر وہ منہ چھپا چھپا کر ہنسیں گے اور آپس میں مشورت کریں گے کہ اس سے اس کے مقدّس خریطے چھین لو اور اس کی زِند اور اس کی اَوَستا پانی میں تر کر کے اس کے حلق میں ٹھونس دو اور کتاب الطواسین سے اس کے ٹخنوں پر ضرب لگاؤ۔ اور شیخِ اکبر کو اور اگستین وَلی کو اور ملک چین کے دیوزاد کو اس کے قریب نہ آنے دو۔

وہ ہنستے ہوں گے مگر اُن کی ہنسی خوف و دہشت کی ہنسی ہو گی اور اُن کا ٹھٹھول خود اُن ہی پر رجعت کرے گا اور یوحنّا، کہ جس کے بدن پر نوحہ و ماتم اور آہ و فغاں مرقوم ہو گا، وہ اگرچہ ٹوٹے ہوئے برتن کی مانند زمین پر پڑا ہو گا مگر سب دیکھیں گے کہ اُس کا چہرہ تو سالم ہے اور اُس کی پیشانی آبِ رواں کی طرح لشکارے مارتی ہے اور وہ کلام کرتا ہے اور اپنے پھیپھڑوں کی قوّت سے ربّ الافواج کو پکارتا ہے کہ:

اے گرجدار آواز والے، تیری آواز بادلوں پر ہے اور تیری آواز میں قدرت و جلال ہے! اور تیری آواز دیوداروں کو توڑ ڈالتی ہے اور آگ کے شعلوں کو چیرتی ہے اور بیابانوں کو ہلا دیتی ہے اور تیری آواز سے ہرنیوں کے حمل گر جاتے ہیں اور تیری آواز جنگلوں کو بے برگ

کر دینی ہے؀؎۔"

اے گرجدار آواز والے! مجھے بھی پکارتے ہوئے سن۔ ہر چند کہ میں نے تیرا رد لکھا اور تیری نفی کی اور تجھے لا، کہا اور تجھ سے سوا اپنی روحِ ناطق کو اپنا الٰہ گردانا اور صبحدم میں پھر ایسا ہی کروں گا کہ اپنے ایقان میں راسخ ہوں اور بے دلی سے ماننے والوں کے اس قرن میں میں اکیلا انکار کرنے والا ہوں۔ تب ایک عجیب بات رونما ہو گی ـــ کہ اُس کے حجرے کی چھت بڑی آواز کے ساتھ شق ہو جائے گی اور چھت کے ٹائل اُڑ اُڑ کر دُور دُور تک جا گریں گے اور سورج سنسناتا ہُوا اُس کے حجرے میں در آئے گا اور اُس کی پسلیوں پر آن رُکے گا اور آواز پڑے گی کہ براوو! براوو

"حنّا بی بی، اس کُتّے کا منہ دُھلا اور اس کے بالوں میں کنگھی کر اور اسے نئی پوشاک پہنا۔"

(پوشاک پہنا)

نئی پوشاک پہن کر زوفے کی ایک سبز شاخ ہاتھ میں اُٹھائے وہ اپنے حجرے سے یُوں برآمد ہو گا جیسے دن طلوع ہوتا ہے۔ وہ اپنے دل میں یہ گمان کرتا آئے گا کہ اب کے شاید اُسے زندگی کرنے کی مہلت ملی ہے۔ سو وہ انجیر کے درخت کے نیچے کھجور کے پتّوں سے بنا ہُوا اپنا سجّادہ بچھا دے گا اور بڑو کے قلم کو قط دے کر صندل کے قلمدان پر رکھ دے گا اور مخمل کے بستے کی گرہ ڈھیلی کر دے گا پھر پتھر سے ٹیک لگا کر کھنگارے گا اور کوچۂ ورّاقاں کی سمت مُنہ کر کے پکارے گا کہ قالَ، قالَ یوحنّا ایلیاہ ـــ تو اُٹنگے پیجامے پہنے، کھجور کے پتّوں کی ٹوپیاں

؀ عہد نامۂ عتیق

اوڑھے، استفسار کرنے والے، گروہ در گروہ اپنی بستیوں سے روانہ ہوں گے۔ ان میں سے بعض اپنے ناقوں پر سوار ہوں گے۔ بعضے اصیل گھوڑوں کو ایڑ لگاتے آئیں گے۔ بعضے پیادہ پا ہی چل پڑیں گے۔

وہ تعداد میں اتنے ہوں گے جتنے نخیلۂ بنی قیدار کے نخل۔ وہ "لبّیک یا اُستاذنا" کہتے ہوئے اُس پر ہجوم کریں گے یہاں تک کہ اُس کا دم الٹنے لگے گا۔ تاہم وہ سجّادے سے اُٹھ کر شکر گزاری میں رقص کرے گا۔ پھر پتھر سے ٹیک لگا کر اُن کے سوال سننے کو ہمہ تن گوش ہو بیٹھے گا۔

تو ناقوں پر آنے والے اور اصیل گھوڑوں کو ایڑ لگاتے آنے والے اور پیادہ پا آنے والے اس سے غسلِ جنابت اور حیض اور موئے زیرِ ناف کے مسائل پوچھیں گے اور یوحنّا ایلیاہ یرقان زدہ مریض کی مانند زرد پڑ جائے گا اور مثلِ پَرِ کاہ لرزہ کرے گا۔

وہ کمزور آواز میں کہے گا کہ لوگو میں طاہر نہیں ہوں۔ میں تو تشکیک کا درس دینے بیٹھا تھا۔ تم مجھ سے یہ استفسار کیوں کرتے ہو؟ سنو کہ میں حیض کی بابت کچھ نہیں جانتا اور غسلِ جنابت کے باب میں منہ نہیں کھول سکتا کہ مباشرت کے بستر سے اُٹھ کر سیدھا سجّادے پر آن بیٹھا ہوں اور دیکھو۔۔۔ یہ کہتے ہوئے وہ حیا ناآشنا جھک کر اپنے تنہ بند کے گوشے تھام لے گا۔ پھر انہیں اپنے کانوں کی لوؤں تک پہنچا دے گا اور تادیر اسی بے ستری میں رقص کرے گا۔

وہ رقص کرتا ہو گا اور آنسوؤں سے روتا ہو گا اور پکار پکار کر اُٹنگے پیجامے والوں سے کہے گا کہ لوگو تم نے تو میرے کلام کو بے حیثیت ٹھیکریوں کی کھنکھناہٹ سے ملا دیا اور میرے سکوت کو بنجر زمینوں کی خاموشی بنا دیا اور میرے جاننے کو اپنے نہ جاننے کے برابر سمجھا۔

"تو لوگو — کیا مجھے اس نئی پوشاک میں بھی برہنگی ہی ملی؟"
(نئی پوشاک میں بھی برہنگی ہی ملی۔)

سو برہنگی اُس کا لباس اور خموشی اُس کا ورثہ اور چراغ کی لَو اُس کا مسکن قرار پائیں گے۔
اور جو پیچ کبھی اُس نے کمایا، وہ ہوا کے پرندوں اور زمین کے درندوں کی خوراک ٹھہرے گا۔
اور اُس کا جھونٹ سیہ منجنیقوں پر پڑا دہکتا رہے گا — کہ جب بھی زمین ایک دائرہ مکمل کرے گی، وہ اُسے اِس کرۂ باد میں اچھال دیا کریں گی۔
سو یہی اُس کا جینا اور یہی اُس کا مرنا کہلائے گا۔
اور جسے اُس نے تلاش کیا اور نہ پایا وہ دوام اب اُس کی پلکوں پر آشیانہ کرے گا کہ اُس کی پلکیں استوائی سورج کی سفاک برچھیاں ہوں گی۔
اور استوائی سورج کی سفاک برچھیوں پر خداوند کی تقدیس اور اُس کے سناٹے کا چھتر ہو گا۔
اور ایک سفید پرواز کے نچے ہوئے پر
اور ایک اندھے کبوتر کی بیٹ پڑی ہو گی۔

ناممکنات کے درمیان

(آکٹوپس — ایک نظم)

میں نے آدی پُرش کے ننگے اسٹیچوایٹ پر ایک روحِ زندہ کو منڈلاتے اور اُترتے ہوئے دیکھا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ زندگی پیدا کرنے کا بس یہی ایک طریقہ ہے۔ میں وہیں تھا جب نیلے امن کا پہلا نقطہ آدی پُرش کے سر کی پشت پر نمودار ہوا اور پھیلنے لگا اور پھیل کر نیلے ٹھنڈے شعلوں کا الاؤ بن گیا اور بھیرویں کی نارنجی لپیٹ کے ساتھ ایک روحِ زندہ ٹیراکوٹا کے اس ننگے اسٹیچوایٹ پر اُتری اور اُس نے کہا "جاگیے برج راج کنور جاگیے، کنول کسم پھولے" اور آدی پرش کے ننگے پن میں نارنجی آگ سے نہایا ہُوا، یک خلیاتی زندگی کا پہلا کنول کھل گیا۔ آدی پُرش بیدار ہُوا۔ وہ منتھانی کی طرح گھومتا ہوا نیلے ٹھنڈے حصار سے باہر آیا، اُس نے برہما نرتیہ کی سات مُدراؤں میں زندگی کو سلام کیا (اس کی آٹھویں مُدرا روحِ زندہ کے لیے تھی) اور میں سمجھ گیا کہ زندگی پیدا کرنے کا بس یہی ایک

طریقہ ہے۔

(آکٹوپس ــــ ایک منظر)

میں جس منظر میں تمہیں شریک کر رہا ہوں، وہ ایک پُل کا منظر ہے۔ یہ پل دو ناممکنات کے درمیان کھنچا ہُوا ہے۔ یہ سارا منظر ہی غیر معمولی ہے۔ بس ایک بات غیر معمولی نہیں ہے اور وہ یہ کہ پُل کا ایک پیل پایہ ریت میں دھنس گیا ہے۔ میں اسے پیل پایہ ہی کہوں گا کیونکہ ایک نظر میں یہ پیل پایہ ہی دکھائی دیتا ہے۔ اصل میں یہ ٹین کا بنا ہُوا ایک آکٹوپس ہے اور اپنے زنگ خوردہ بدن کے ساتھ ریت میں دھنسا ہوا ہے، بس اس کی سونڈیں آزاد ہیں۔ یہ آکٹوپس پُل، گھی کے پُرانے کنستروں کو چیر کر بنایا گیا ہے۔ آکٹوپس عام تین منزلہ عمارت جتنا اُونچا ہے اور عین مین اس آکٹوپس کی طرح ہے جسے ہم اپنے دہشت ناک خوابوں میں دیکھتے ہیں۔ مگر خواب کا آکٹوپس بہت چھوٹا ہوتا ہے۔

ٹین کے اس آکٹوپس کی آٹھوں سونڈیں ایک دوسرے سے جُفتی کھاتی ہوئی اس طرح پھیل گئی ہیں کہ کچھ سونڈیں پل کی دائیں محراب بناتی ہیں اور کچھ بائیں۔ ایک دو سونڈیں پیش منظر میں تمہاری میری طرف بڑھ آئی ہیں۔ اگر تم غور سے دیکھو تو ان کا مہیب سایہ ہمارے اُوپر پڑتا دکھائی دے گا۔ ویسے وہ ہمارے اوپر اتنی بلندی پر معلق ہیں کہ بے موسم کے بادل کی طرح ان سے کوئی فوری خطرہ محسوس نہیں ہوتا۔ آکٹوپس کی ایک سونڈ عقب میں اِنفی نٹی کی طرف بڑھ گئی ہے، مگر اس سونڈ کو ہم اور تم نہیں دیکھ سکتے۔ یہ سونڈ ہمارا تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ ہم صرف محرابیں بنانے والی سونڈیں اور اپنی طرف اُمڈ آنے والی سونڈیں ہی دیکھ سکتے ہیں۔ جن کی مجموعی تعداد سات ہے۔ جس سونڈ کا رُخ اِنفی نٹی کی طرف ہے، وہ آٹھویں ہے۔

آکٹوپس پر ایک مکمل سیاہ پینٹ لگایا گیا ہے جس میں سیاہی کے سوا کسی دوسرے امکان کو سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ یہ مکمل سیاہ پینٹ اس درجہ سیاہ ہے کہ تمام کی تمام روشنی جذب کر لیتا ہے، ایک کرن بھی منعکس نہیں ہونے دیتا۔ اُسے کچھ دیر غور سے دیکھنے کی کوشش کرو تو یوں لگے گا جیسے بینائی کے ساتھ تمہاری آنکھوں کے ڈھیلے بھی کھنچے جا رہے ہوں۔ سیاہی کو دوہرا گھناؤنا بنانے کے لیے سونڈوں کے پیٹ پر پوری لمبائی میں سکرز کی چار قطاریں لگائی گئی ہیں۔ عام، روزمرہ آکٹوپس اپنی سونڈوں کے پیٹ پر دھڑکتے اور کھلتے بند ہوتے ہوئے سکرز کی قطاریں پہنے رہتے ہیں۔ یہ قطاریں آکٹوپس کا سب سے دہشت ناک حصّہ ہوتی ہیں۔ ٹین کے اس آکٹوپس پر سنہنے پلاسٹک کے لجلجے سکرز لگے ہوئے ہیں جو کسی اندرونی برقی میکانکی نظام کے تحت بہت فحش انداز میں دھڑکتے اور کھلتے بند ہوتے ہیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اُن میں سے بعض سکرز پورے ہولناک بلاسٹ کے ساتھ زہن چیر دینے والی آوازیں چیختے ہیں۔ ان میں بسوں کے پریشر ہارن نصب ہیں۔ جو سکرز پریشر ہارنوں سے خالی ہیں، بظاہر بے ضرر دکھائی پڑتے ہیں مگر ان میں ایسے آلات لگے ہیں جو ننگے کانوں سے نہ سنائی دینے والی الٹراسونک آواز پیدا کرتے ہیں اور جب وہ اپنی بے آواز آوازیں چیختے ہیں تو اعصاب کے چیتھڑے اڑا دیتے ہیں۔ باقی سکرز سے اندھا کر دینے والی تیز سفید روشنی انرتی ہے۔ یہ دھڑکتے نہیں ہیں بس ان کی روشنی جھپکتی رہتی ہے اور اس جھپک کی تال میں کوئی ترتیب نہیں ہے۔ روشنی کی سفیدی کافور کی سفیدی کی طرح ٹھنڈی اور مُردہ ہے اور ایک غیر شخصی سوگواری سے تر بتر ہے۔ یہ روشنی ٹین کی سونڈوں پر لگے مکمل سیاہ پینٹ کی وجہ سے اپنی قطعی اور طے شدہ حدوں میں رہتی ہے آکٹوپس کی سونڈوں کو یا اس کی سیاہ دہشت کو روشن نہیں کر سکتی۔ وجہ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔

یہ پُل، جیسا کہ میں نے بتایا، دو ناممکنات کے درمیان کھنچا ہُوا ہے اور ہر اعتبار سے مردہ ہے۔ اس میں بڑھ کر پھیلنے یا کسی بھی طرح اپنی شکل بدلنے یا حرکت کرنے کا امکان موجود نہیں ہے، البتّہ آکٹوپس کے اصل بدن کو ریت کا جو تودہ ڈھکے ہوئے ہے، وہ تودہ زندہ ہے مگر یہ زندگی جانوروں اور پودوں اور پتّھروں کی زندگی سے مختلف ہے کیونکہ تودہ اپنی طے شدہ حدوں سے بڑھ کر پھیلنے، شکل بدلنے اور حرکت کرنے پر قادر نہیں ہے، بس اس کی ریت سنکھوں مہاسنکھوں ننّھے چمکدار گول کیڑوں کی طرح کلبلاتی رہتی ہے۔ اس ریت کے کسی ایک ذرّے کو کبھی غور سے دیکھنا، وجہ سمجھ میں آ جائے گی۔ مٹ میلی گیلی چمک میں لتھڑا ہُوا ہر ذرّہ کہیں نہ کہیں پہنچنا چاہتا ہے۔ وہ سب کہیں نہ کہیں پہنچنا چاہتے ہیں اور اس کوشش میں برابر ایک دوسرے کو ٹھیلتے دھکیلتے رہتے ہیں۔ سماعت پر بہت زور دے کر سننا چاہو تو کبھی ان کی فحش آوازیں سننے کی کوشش کرنا، وہ سب ایک بے ضابطہ ردم میں یکساں پِچ پر چلاّتے رہتے ہیں۔ "چل بھئی! چل بھئی! چل بھئی! چل بھئی!" جیسے کوہِ ندا کے مسافر کسی مقدّر کی سفّاک ڈور سے بندھے کھنچے چلے جا رہے ہوں۔ "چل بھئی! چل بھئی! چل بھئی!" مگر یہ گیلی چمک والے ننّھے گول کیڑے اصل میں جانتے کہیں نہیں ہیں، تودے ہی میں گردش کرتے رہتے ہیں اور اپنی مکروہ آوازوں سے مٹ میلی چمک پھیلاتے رہتے ہیں۔ تودہ ابھی تک اتنا ہی ہے اور وہیں ہے جہاں تھا، اور اتنا ہی اور وہیں رہے گا جہاں ہے —— بس یہ کلبلاہٹ چلتی رہے گی۔

ناممکنات کے درمیان ریت کے تودے کے علاوہ اس منظر کے فرش پر دور تک منجمد لہروں کا جال بچھا ہُوا ہے۔ روشنیوں والے سکرنز سے اندھا کر دینے والی جو سفید روشنی نکلتی ہے، وہ ان لہروں پر اُتر کر بڑے من موہنے انداز میں

جھلملانے لگتی ہے۔ پورے منظر میں بس ایک یہی بات دلاسا دینے والی ہے، لگتا ہے یہ بے جان، مُتحجّر لہریں نہ ہوں سانس لیتا ہُوا پانی ہو جس کی سطح کے نیچے زندہ چیزیں حرکت کر رہی ہوں، اُگ رہی ہوں۔

میں ان مُتحجّر لہروں کے بصری دھوکے میں آ کر پہلی بار اس منظر کے فرش پر دُور تک دوڑتا چلا گیا تھا اور پشیمان ہوا تھا۔ اور یقین کرو کتنی ہی بار روحِ زندہ کا بوجھ اٹھائے اس منظر کے بے زندگی فرش پر دوڑا ہوں کہ شاید میرے پیروں کی دھمک سے چیزیں پیدا ہو جائیں اور سانس لینے لگیں۔

میں بار بار اپنا بوجھ اٹھائے اس منظر کے سفّاک فرش پر دوڑتا ہُوا گیا ہوں اور اپنے تلوے لہو لہان کر لیے ہیں مگر زندگی پیدا نہیں کر سکا، حالانکہ میں سرخ کی نارنجی لپیٹ میں گھرا ہوا دوڑا ہُوں اور ان دونوں آکٹوپس محرابوں سے پیاسی ابابیل کی طرح سنسناتا ہُوا گزرا ہُوں، اور پکارتا ہُوا گزرا ہوں۔

❁

فورک لفٹ ۳۵۲

پرولوگ :

حضرت شاہ، منیٹی ننس میکانک (رات ڈیوٹی) فلیٹ سیکشن (ایسٹ)

پورٹ جالنا کا بیان

.... چوبیس تاریخ گزرنے کے بعد جب میں رات میں اپنی ڈیوٹی پر آیا تو میں نے دیکھا کہ فورک لفٹ ۳۵۲ DAMAGED VEHICLES کی لائن میں کھڑی ہے اور اس کا ایک پہیّا تیل میں بھیگا ہوا پڑا ہے۔ دستخط حضرت شاہ ایم ایم (ناٹ)

ملزم عبدالرحیم پرمانٹ کلینر / ڈرائیور۔ فلیٹ سیکشن (ایسٹ) پورٹ جالنا کا بیان

میں نے چوبیس تاریخ کو صبح فلیٹ سیکشن میں دن کی ڈیوٹی پر رپورٹ کی تو مجھے ڈیوٹی سلپ دی گئی جس میں میری بکنگ فورک لفٹ ۳۵۲ پر کی گئی تھی۔ اس فورک لفٹ کو ۱۶-۱۵ نمبر برتھ پر کام کرنا تھا۔ تیل پانی چیک کرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ فورک لفٹ میں بیٹری نہیں ہے، میں نے الیکٹریشن عبدالرحیم بھوٹیاں سے کہا کہ اس فورک لفٹ میں بیٹری نہیں ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس گاڑی

میں کچھ دن پہلے CHARGED بیٹری لگائی گئی تھی! اب جو اس میں بیٹری نہیں ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ گاڑی صحیح کنڈیشن میں نہیں ہے۔ اس لیے میکانک نے اس کی بیٹری نکال کر رکھ دی ہے۔ میں نے اس کی اطلاع بکنگ کلرک مسٹر جاوید کو دی، انہوں نے LOG BOOK میں ENTRY کر لی۔ اس دوران وہاں LEADING DRIVER میر زمان بھی آ گئے، میں نے ان کو یہ صورت حال بتائی تاکہ اُن کے ذہن میں رہے اور اونچ نیچ کی صورت میں مجھ کو ذمّے دار نہ ٹھہرایا جائے۔ پھر انچارج انسپکٹر منوّر خاں صاحب بھی وہاں آ گئے، میں نے ان کو بھی یہی بات بتائی۔ انہوں نے کہا ہاں میں جانتا ہوں یہ گاڑی DEFECTIVE ہے تم بیٹری لگا کے اُسے ٹھیک کرا کر اور لے جاؤ۔ انسپکٹر منوّر خاں صاحب نے ایم ایم عبدالمجید کو خود کہا کہ اس گاڑی کو ٹھیک کر دو۔ MAINTENANCE MECHANIC عبدالمجید نے پرانی SPARE بیٹری لگا کر یہ گاڑی پلیٹ فارم پر کھڑی کی اور سامنے سے RIGHT WHEEL اور ڈرائیور کے بیٹھنے کے حساب سے LEFT WHEEL میں SPANNER ڈال کر کچھ کام کیا جو میں نہیں دیکھ سکا اور گاڑی میرے حوالے کر دی اور کہا کہ اب یہ ٹھیک ہے اسے لے جاؤ۔ جب انہوں نے کہا کہ گاڑی ٹھیک ہو گئی ہے تو میں گاڑی پر بیٹھ کر اس کو چلاتا ہُوا برتھ نمبر ۱۶-۱۵ پر لے گیا، وہاں STEVEDORE کا فورمین موجود تھا میں نے اُس سے کام کے لیے پوچھا تو اُس نے کہا کہ فورک لفٹ کا کوئی کام نہیں ہے، تم واپس چلے جاؤ مگر میں وہاں ساڑھے دس پونے گیارہ بجے تک بیٹھا رہا پھر میں نے فورمین سے کہا کہ میں گیراج جا رہا ہوں تمہیں ضرورت ہو تو وہاں سے بلوا لینا۔ اُس نے کہا، ٹھیک ہے۔ میں گاڑی کو لے کر گیراج کی طرف چلا۔ راستے میں مجھے بریک لگانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو بریک لگانے پر آگے کا وہ WHEEL جس پر میکانک عبدالمجید نے کوئی کام نہیں کیا تھا اور صرف SPANNER ڈال

کر گھما دیا تھا، وہ ایک طرف گھوم گیا اور بریک نہیں لگا۔ میں کسی نہ کسی طرح آہستہ آہستہ گاڑی کو گیراج تک لے آیا۔ جب میں گیراج میں داخل ہو رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ انچارج انسپکٹر منوّر خاں صاحب وہاں پہلے سے موجود ہے اور پتا نہیں کیوں مسکرا رہا ہے، انہوں نے مجھ سے پوچھا کیا بات ہے، کیا بریک فیل ہو گیا ہے ؟ (عالی جناب انکوائری افسر صاحب سے گزارش ہے کہ انسپکٹر منور خاں صاحب کے اس سوال کی نوعیت کو نوٹ فرمائیں) میں نے کہا جی ہاں میں اسی لیئے واپس آ رہا ہوں، مگر صاحب آپ کو کیسے پتا چل گیا، میں نے تو ابھی کسی سے ذکر بھی نہیں کیا ہے۔ انہوں نے وہیں کھڑے ہو کر مسکراتے ہوئے میکانک فاروق چودھری کو حکم دیا کہ اس گاڑی کو چیک کرو۔ فاروق چودھری نے پلیٹ فارم پر گاڑی کھڑی کر کے میرے بتانے سے پہلے اُسی ڈرم کو کھولنا شروع کر دیا جس پر میکانک مجید نے کام نہیں کیا تھا۔ اس پر میں نے فاروق میکانک سے پوچھا کہ کیا آپ کو پہلے سے معلوم تھا کہ اس پہیئے میں DEFECT ہو گا تو وہ جواب دیئے بغیر میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔

<u>عبدالمجید مینٹی ننس میکانک، فلیٹ سیکشن (ایسٹ) پورٹ جالنا کا بیان</u>

.... میں نے ڈھائی بجے جب دونوں وہیل چیک کیے تو RIGHT WHEEL سے بریک آئل بہہ رہا تھا۔ وہیل کھول کر میں نے دیکھا کہ ایک اسٹڈ NUT ٹوٹ گیا تھا، اس کے گر جانے سے ڈرم کٹ گیا تھا اور بریک لائیننگ اور شو BEND ہو گئے تھے۔ میں نے اس کی رپورٹ انچارج انسپکٹر منوّر خاں صاحب کو دے دی۔

(بیان جاری ہے)

<u>حضرت شاہ مینٹی ننس میکانک (رات ڈیوٹی) فلیٹ سیکشن (ایسٹ)</u>

<u>پورٹ جالنا کا بیان</u>

سوال: کیا فورک لفٹ کے وہیل میں STUD NUT کے LOOSE ہونے کی

وجہ سے یا کسی دوسرے DEFECT کی وجہ سے فورک لفٹ چلاتے وقت ڈرائیور کو ان DEFECTS کا پتا چل سکتا ہے۔

جواب: اگر STUD نٹ LOOSE ہو گیا ہے تو لا محالہ پہیئے میں سے آواز آئے گی اور ایک اناڑی شخص بھی یہ آواز سن کر جان لے گا کہ پہیئے میں کوئی گڑبڑ ہے۔

سوال: میں یہی سوال تم سے پھر پوچھتا ہوں — خوب سوچ کر بتاؤ کہ فورک لفٹ کے چلانے میں اگر کسی وہیل کا کوئی STUD نٹ ڈھیلا ہو جائے تو کیا اُس کا پتا ڈرائیور کو چل سکتا ہے؟

جواب: جی ہاں۔ کیونکہ اسٹڈ نٹ کے LOOSE ہونے سے فورک لفٹ کے پہیئے سے انجن کے شور سے اُونچی اور مختلف آوازیں پیدا ہونے لگتی ہیں اور اگر ڈرائیور بہرا یا بدمعاش نہیں ہے تو سن سکتا ہے اور فوری طور پر مرمت کروا سکتا ہے اور VEHICLE کو بڑے نقصان سے بچا سکتا ہے۔ دستخط حضرت شاہ۔ ایم ایم (ریٹائرڈ)

<u>عبدالمجید مینٹی ننس میکانک، فلیٹ سیکشن (ایسٹ) پورٹ جالنا کا بیان</u>

(گذشتہ سے پیوستہ)

.... جواب: جی ہاں، اگر اسٹڈ LOOSE ہو کر ڈرم میں گھومتا رہے گا تو آواز سے ڈرائیور کو پتا چل جائے گا۔ ویسے اگر اسٹڈ NUT اِدھر اُدھر پھنس جائے تو آواز نہیں ہو گی۔ (بیان جاری ہے)

<u>غلام رسول، اے، ڈرائیور، فلیٹ سیکشن (ایسٹ) پورٹ جالنا کا بیان</u>

جواب: جی ہاں، چلاتے وقت فوراً اس کا پتا چل جاتا ہے کیونکہ وہیل سے آواز آنے لگتا ہے۔ دستخط غلام رسول

<u>عبدالمجید مینٹی ننس میکانک، فلیٹ سیکشن (ایسٹ) پورٹ جالنا کا بیان</u>

(گذشتہ سے پیوستہ)

سوال: اسٹڈ LOOSE ہونے سے اتنا نقصان جو کہ ڈرم وغیرہ کو ہوا یہ کتنے عرصے میں ہوتا ہے، اور آپ یہ بھی بتائیے کہ ڈرم کٹ کٹ کر اتنا برادہ جو ڈرم میں جمع ہو گیا تھا اُس کے جمع ہونے میں کتنا وقت لگا ہو گا؟

جواب: اگر LOOSE STUD برابر رگڑ کھاتا رہے تو کاٹنے کا اتنا کام تین چار گھنٹے میں ہو گا اور اگر زیادہ ٹائٹ ہے تو یہ نقصان دس منٹ میں ہو سکتا ہے کیونکہ ڈرم کا لوہا نرم ہوتا ہے، اسے CAST IRON سے بنایا جاتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ جنابِ والا، برابر رگڑ کھانے سے آواز بھی پیدا ہو گی جو کہ ہزاروں میل تک سنی جا سکتی ہے۔ لیکن اگر اسپرنگ وغیرہ میں اسٹڈ پھنس گیا ہے تو یہ آواز نہیں سنی جا سکتی مگر اندازہ ہو جاتا ہے ـــــ ویسے پھنسنے کے بعد اسٹڈ رگڑ بھی نہیں کھائے گا۔

سوال: یہ بتائیے کہ اگر اسٹڈ زیادہ سختی سے رگڑ کھا رہا ہے تو کیا اس میں زیادہ آواز ہو گی اور ہلکی رگڑ کھا رہا ہے تو کیا کم آواز ہو گی؟

جواب: جی ہاں۔ اگر ہلکی رگڑ کھا رہا ہے تو معمولی آواز ہو گی جو ہو سکتا ہے کہ پکڑ میں نہ آئے مگر تاریخ اتنی ہلکی آوازوں کو بھی سُن لیتی ہے۔

سوال: آپ نے ڈرم کھولا تو کیا STUD نٹ اسپرنگ میں پھنسا ہوا تھا؟

جواب: ڈرم ہلانے کے بعد مشکل سے کھلا اور جب باہر نکالا گیا تو نٹ بھی گر گیا اس لیے معلوم نہیں کہ وہ اسپرنگ میں پھنسا ہوا تھا یا آزاد تھا مگر جیسا کہ جنابِ والا مجھ سے بہتر جانتے ہیں اس بات سے فرق کوئی نہیں پڑتا، نقصان بہرحال ہو چکا تھا۔

سوال: وہ تو ٹھیک ہے مگر میں حقائق کی تہ تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ ملزم ڈرائیور عبدالرحیم کا بیان ہے کہ جب تقریباً گیارہ بجے وہ واپس گیراج میں پہنچا تو فاروق چودھری میکانک نے پہیے کو چیک کیا اور عبدالرحیم کے اس سوال پر کہ

کیا اُسے پہلے سے معلوم تھا کہ DEFECT اس پہیے میں ہوگا۔ میکانک فاروق کوئی جواب دیئے بغیر عبدالرحیم کی طرف دیکھ کر مسکرایا بھی پھر جب اُس نے ڈرم کھولا تو اس میں ڈرم کا بُرادہ وغیرہ موجود تھا۔ اور اسٹڈ نٹ SPRING میں پھنسا ہوا تھا مگر اس کے برخلاف آپ کا کہنا ہے کہ گیارہ بجے نہیں بلکہ تقریباً ڈھائی بجے ڈرائیور رحیم نے آپ کو اطلاع دی تھی کہ بریک فیل ہو گیا ہے اور فاروق نے نہیں بلکہ آپ نے ڈرم کھول کر چیک کیا تھا اور یہ کہ اسٹڈ NUT اسپرنگ میں نہیں پھنسا تھا — آپ کے پاس ان سب باتوں کا کیا جواب ہے ؟

جواب : اس گاڑی کا ڈرم تقریباً ڈھائی بجے خود میں نے کھولا تھا۔ فاروق بھی وہاں موجود تھا، دیگر یہ کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ ڈرم کھولنے پر نٹ گر چکا تھا اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ پھنسا ہوا تھا کہ آزاد تھا۔

سوال از پرمانٹ کلینر/ڈرائیور ملزم رحیم : یہ جو WHEELS گھما کر بریک چیک کیے جاتے ہیں تو کیا میکانک پہیے کو ہاتھ سے گھما کر چیک کرتے ہیں یا اسٹارٹ بھی کرتے ہیں ؟

جواب از مجیب : ہاتھ سے گھما کر بھی اور اسٹارٹ کر کے بھی دیکھا جاتا ہے۔

سوال از پرمانٹ کلینر/ڈرائیور ملزم رحیم : مجھے صبح گاڑی دینے سے پہلے آپ نے سیٹ پر کسی کو بٹھا کر اسٹارٹ گاڑی میں وہیل کو MECHANICAL PROPULSION دلوا کر دیکھا تھا ؟ اور کیا آپ نے گھومتے ہوئے پہیوں میں بریک وغیرہ لگوا کر دونوں پہیوں میں اپنا اطمینان کر لیا تھا ؟

جواب : جی ہاں۔

سوال از پرمانٹ کلینر/ڈرائیور ملزم رحیم : سیٹ پر کون آدمی بیٹھا تھا ؟ کیا میں تھا ؟

جواب : نہیں، آپ نہیں تھے ROUTINE میں تو جیک اپ (JACK UP) کی ہوئی گاڑی کی سیٹ پر خود گاڑی کا ڈرائیور ہی بیٹھتا ہے اور میکانک چیک کرتا ہے لیکن ڈرائیور کی عدم موجودگی یا متنازعہ موجودگی یا مشتبہ موجودگی کی صورت میں، میں اپنے HELPER کو بٹھا کر اُس کی مدد سے بھی چیک کرتا ہوں مجھے اب یاد نہیں کہ سیٹ پر اس وقت کس کو بٹھایا تھا۔

سوال از پرمانٹ کلینر / ڈرائیور ملزم رحیم : لیکن میں تو برابر موجود رہا، ہمیشہ سے وہیں تھا۔ آپ کو اپنے ہیلپروں کی ضرورت نہیں پڑنا چاہیے تھی۔

جواب : ضرورت پڑی تھی اس لیے کہ آپ وہیں تھے مگر وہاں نہیں تھے۔

سوال از پرمانٹ کلینر / ڈرائیور ملزم عبدالرحیم : آپ مسکرا کیوں رہے ہیں اور اس مسکرانے کے عمل میں آپ کے کتنے ہیلپر ہیں ؟

جواب : سوال کے دونوں حصے IMPERTINENT ہیں اس لیے سوال کی حدود میں رہتے ہوئے جواب دینے کی بجائے میں ایک بونس کا جواب دے رہا ہوں —— وہ یہ کہ میرا ایک ہیلپر ہے۔

سوال از پرمانٹ کلینر / ڈرائیور ملزم رحیم : کیا اُس کا نام بتائیں گے ؟

جواب : فاروق چودھری

سوال از انکوائری افسر : فاروق وہی جو ملزم ڈرائیور عبدالرحیم کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا؟

جواب : جی ہاں —— مگر میں نے اس کو مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔

سوال از پرمانٹ کلینر / ڈرائیور ملزم عبدالرحیم : میں نے اُسے اور انچارج انسپکٹر منوّر خاں صاحب دونوں کو مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔

جواب از انکوائری افسر : افسروں کے مسکرانے یا نہ مسکرانے کے بارے میں

اس مرحلے پر کوئی سوال نہ کیا جائے تو بہتر ہے۔

سوال از پرمانینٹ کلینر / ڈرائیور ملزم عبدالرحیم : میں اس مرحلے پر اپنا مسکرانے کا حق محفوظ رکھتے ہوئے عبدالمجید ولد نامعلوم مینٹی ننس میکانک فلیٹ سیکشن (ایسٹ) پورٹ جالنا سے سوال کرتا ہوں کہ مسٹر عبدالمجید ولد نا . . . .

سوال از انکوائری افسر : کیا غیر متعلق باتوں سے پرہیز کیا جا رہا ہے ؟

سوال از پرمانینٹ کلینر / ڈرائیور ملزم عبدالرحیم : . . . . سوال کرتا ہوں کہ آپ جو یہ کہتے ہیں کہ بریک فیل ہونے کے بعد آپ نے DAMAGED پہیئے کے ڈرم کو کھولا تھا تو یہ بتائیے کہ اس میں پڑا ہوا بُرادہ کیا بریک آئل سے تر تھا یا بریک آئل بُرادے تک بالکل نہیں پہنچا تھا کیونکہ تیل پلیٹ سے بہہ بہہ کر WHEEL کے ٹائر پر گر رہا تھا۔ ویسے اس بارے میں INTERNATIONAL RED CROSS زیادہ اچھی طرح بتا سکے گا۔

سوال از انکوائری افسر : ڈرم ٹوٹنے سے کیا بریک آئل باہر آنے لگتا ہے ؟

جواب : فورک لفٹ کے اس پہیئے میں ڈرم اور شوز اس بُری طرح DAMAGE ہو گئے تھے کہ اُن سے تیل نکل کر بہہ جانا لازمی تھا۔ اگر معمولی نقصان ہوتا تو ممکن ہے تیل اندر ہی رہتا یا زیادہ سے زیادہ کچھ رسنے سا لگتا مگر ایسا نہیں تھا، پورا WHEEL تیل سے نہا گیا تھا۔

سوال از انکوائری افسر (دہشت کی جھرجھری کے ساتھ) آپ دونوں یہ کہتے اور سنتے ہوئے مسکرا کیوں رہے ہیں ؟ (بیان جاری ہے)

انسپکٹر منوّر خاں، انچارج فلیٹ سیکشن (ایسٹ) پورٹ جالنا کا بیان

. . . . سوال : کیا ڈرائیور ملزم عبدالرحیم، لائسنس یافتہ ڈرائیور ہے ؟

جواب : نہیں جی اُس کے پاس لائسنس نہیں ہے۔ نیز یہ کہ اُس کا عہدہ

ڈرائیور کا نہیں ہے۔ وہ PERMANENT CLEANER ہے جنابِ والا۔

سوال: کیا آپ کے پاس لائسنس یافتہ ڈرائیور نہیں تھے؟

جواب: جنابِ والا۔ ہمارے پاس لائسنس یافتہ ڈرائیور ہیں اور اُس دن بھی تھے۔

سوال: کیا آپ اصولی طور پر اس بات کے حق میں ہیں کہ کلینروں کو محکمے کی قیمتی VEHICLES حوالے کر دی جائیں؟

جواب: جی نہیں۔

سوال: اگر اصول کے خلاف تھا تو یہ فورک لفٹ پرمانینٹ کلینر ملزم عبدالرحیم کے حوالے کیوں کی گئی؟

جواب: اس بارے میں کیا عرض کر سکتا ہوں جنابِ والا۔

سوال: آپ مسکرا کیوں رہے ہیں۔ کیا میرا یہ سوال مضحکہ خیز تھا؟

جواب: کیا عرض کر سکتا ہوں۔

سوال: آپ کم از کم مسکرانے سے تو باز رہ سکتے ہیں؟

جواب: کھس کھی کھی کھی ہپ!

سوال: مسٹر انسپکٹر کیا آپ کو معلوم نہیں کہ آپ انکوائری میں بیٹھے ہیں؟

جواب: قہہ قہہ قہہ قاہ قاہ قاہ!

سوال: ہنسنا بند کرو، سنا نہیں؟

جواب: قاآآہ قاآآآہ۔ اووووہ اووووہ اوو!

سوال: ہنسنا بند کرو۔ ہانسنا کے بچے، کہتے ہیں تمہیں ڈسمس کرادوں گا، سمجھے؟

جواب: جنابِ والا میں معافی کا خواستگار ہوں، ویسے اجازت ہو تو جی میں کچھ کان میں گوش گزار کرنا چاہتا ہوں جنابِ والا۔

سوال: ٹھیک ہے تم میرے قریب آ سکتے ہو۔
جواب: پھُس پھُس پھُس پھُس پھُس کھی کھی کھی کھی!
سوال: اوئے کھی کھی کھی اِی اِی ایہہ کیہہ کیہہ کیہہ کیہہ۔؟
جواب: قہہ قہہ قہہ قاہ قاہ!
سوال: قاہ قاہ قاہ قاہقاہ۔؟
سوال و جواب: قاہقاہ قاہ قاہ قاہ قاہ قاہ قاہ، !؟

ایک وحشی خیال کا منفی میلاپن

میں کسی روز اس مسئلے کو حل کروں گا۔

اس دہاڑتی ہوئی، ولگر، سڑک کے کنارے کنارے چلتے ہوئے روز بڑی پابندی سے ایک وحشی خیال بیدار ہو جاتا ہے۔ یہ میرے پاس بہت دن سے ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خاصا میلا ہو گیا ہے۔ اس کا میلاپن کرسی کے ہتھّوں، دروازے کے پٹوں اور تکیے کے غلافوں کے میلے پن سے مختلف ہے۔ ان سب چیزوں کا میلاپن تو استعمال سے وابستہ مثبت میلاپن ہے، پر میرے اس وحشی خیال کا میلاپن وہ ہے جو جاندار چیزوں کو گِمک کے طور پر اٹھائے پھرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ جیسے سانڈے کا تیل بیچنے والا اپنے زندہ سانڈے کو روز گھر سے بازار لائے اور پھر گھر لے جائے اور روز کے لانے لے جانے سے وہ میلا ہو جائے تو یہ اسی طرح میلا ہُوا ہے۔ اس کی کمر میں بندھی ہوئی ڈوری بھی میلی ہو گئی ہے اور ہر وقت کی ہینڈلنگ سے اس کے ناخن جھڑنے لگے ہیں۔ میں اس وحشی خیال کے میلے پن سے شرمندہ ہوں۔ کسی دن اسے اسپرٹ سے صاف کروں گا اور اسے اس کا کنوارا ٹیکسچر اور ستھراپن لوٹا دوں گا۔ ممکن ہوا تو نئے ناخن بھی لگا دوں گا بس وقت ملنے کی بات ہے۔

ایس، پی، سی، اے کے منافق انسپکٹر چاہے کتنا ہی شور مچائیں میں اسے آزاد نہیں کر سکتا۔ میں انہیں دھوکا بار شوٹ دے کر یا ڈرا دھمکا کر مطمئن کر دوں گا۔ اس لیے کہ میرے اور دیوانگی کے درمیان ایک وحشی خیال کا سانڈا ہی تو دیوار ہے۔ میں یہ دیوار کیسے ڈھا سکتا ہوں۔

مسئلہ یہ ہے کہ دیوار کے اُس طرف یا اس طرف پتھر کی ایک عمارت ہے، یہاں لوگ جھوٹی گواہیاں دینے اور جھوٹے ایفی ڈے وٹ بنوانے آتے ہیں۔ اس کی سنگین سیڑھیاں چڑھتے ہوئے تم نے دیکھا ہو گا کہ دائیں اور بائیں گملوں کی قطاریں لگی ہیں۔ ان گملوں میں ہیری پام، کینا، کولیئس اور کروٹن کے پودے انتظار ہی انتظار میں نمک لگے بھینس کے چمڑے کی طرح سوکھ کر مڑ گئے ہیں اور سیڑھیاں چڑھتے ہوئے سُوَر کے بچوں نے ہیری پام کے بالوں بھرے پتّوں پر پان کی پیکیں مار دی ہیں اور یہ پتّے خون میں لتھڑے ہوئے پنجوں کی طرح ہو گئے ہیں جب کہ ان سیڑھیوں پر سجائے جانے میں ان کا کوئی قصور نہیں تھا۔ یہ بے چارے تو اپنی سادگی میں مارے گئے۔

میں جب بھی جھوٹی گواہی دینے یا جھوٹا ایفی ڈے وٹ بنوانے وہاں گیا ہوں، مجھے سب سے زیادہ ہیری پام کے بالوں بھرے ضعیف پنجوں پر ترس آیا ہے۔ سالوں نے ذرا بھی رحم نہیں کیا۔ آتے جاتے اُن پر خوب تھوکا ہے۔ یہ پام کے ضعیف پنجے ہمیشہ سے ضعیف ہیں اور کیونکہ یہ سفید بالوں والے اور مُرجھائے ہوئے اور مسکین اور پُر امید ہیں اسی لیے حرامیوں کو اُن پر تھوکنے کا خیال آیا ورنہ وہ ان پر تھوکتے نہیں۔ انہیں، کینا، کروٹن اور کولیئس کی طرح پیاس میں اور مایوسی میں اور انتظار میں مڑ جانے دیتے۔

اصل قصّہ کیا ہے۔ وہ سالے سمجھتے ہیں کہ پام کوئی نظریہ ہے —— یا شاید

مزاحمت ہے یا رکنے کا اشارہ ہے یا کیا ہے اسی لیے وہ اس پر تھوکتے ہیں - ان بدمعاشوں کو اصل بات نہیں معلوم ـــــ میں بتاتا ہوں :ـــ بات بس اتنی ہے کہ یہ پام بہت سے ڈوبتے ہوئے بوڑھے آدمیوں کے پنجے ہیں جنہیں ایک ساتھ باندھ کر ڈوبنے کے لیے پھینک دیا گیا ہے اور وہ ڈوبنے سے پہلے آخری بار ایک گونگا ایس' او، ایس دے رہے ہیں کہ بچاؤ، بچاؤ، بچاؤ۔ میں سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس پیک بھرے گملے سے سفید بالوں میں لپٹی ہوئی بچاؤ، بچاؤ کی آوازیں اُٹھتی دیکھتا ہوں اور روہانسا ہو جاتا ہوں۔

بدمعاش کہیں کے ـــــ ڈوبتے ہوئے بوڑھے آدمیوں کی صاف ستھری تدفین بھی نہیں دیکھ سکتے۔ اُن پر تھوکتے ہیں ـ کتے !

تم ان کتوں کو نہیں جانتے۔ میں بھی نہیں جانتا۔ انہیں کوئی نہیں جانتا۔ ان کی صورتیں اس قدر مکروہ اور اتنی ناقابلِ یقین ہیں کہ روبرو آ کر انہیں کوئی بھی نہیں پہچان سکتا۔ یہ اپنی غیر حاضری میں پہچانے جاتے ہیں جیسے کینا، کولئیس اور کروٹن کے مرتے نزتے انتظار میں یا ہیبڑی پام کے خوں چکاں پنجوں میں، یا ان کہ بہہ آوازوں اور کہنیوں کی چبھن میں جنہیں وہ پشت سے میری طرف بھیجتے ہیں۔ میں نے کئی بار اچانک گھوم کر انہیں دیکھنے اور صورت سے پہچان لینے کی کوشش کی ہے مگر وہ پکڑ میں نہیں آئے۔ ہمیشہ یہی ہوا ہے کہ میں نے مڑ کر دیکھا تو میرے پیچھے کینا، کولئیس اور کروٹن کی طرح انتظار میں مرتے نزتے مایوس لوگ ہی کھڑے ہوئے ملے جن کی پشت میں بھی وہی حرام زادے اپنی کہنیاں اور آوازیں چبھو رہے تھے۔ میں نے کئی بار اُن پیچھے کھڑے ہوئے لوگوں سے کہا کہ ذرا گھوم کر دیکھنا، وہ حرامی کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں تو وہ مایوسی سے سر ہلا کر کہنے لگے کہ بھائی ہمیں معلوم ہے۔ وہ ہمارے پیچھے ہیں اور کہنیاں اور آوازیں چبھو رہے ہیں۔ ہم نے گھوم کر دیکھ

بھی لیا تو ہمیں ہماری طرح کے مڑے تڑے لوگ ہی نظر آئیں گے۔ وُہ سُور کے تخم
نہیں بلیں گے جو ہماری اور تمہاری اور اُن کی پشت میں کہنیاں اور آوازیں چبھوتے
رہتے ہیں۔ اگرچہ یہ فضول سی دلیل تھی اور مایوسی کی بات تھی مگر درست تھی اور میرے
تجربے میں تھی اس لیے میں نے ہر بار چپ رہنا ہی مناسب سمجھا اور چپ رہا۔ مگر
اب میں سوچتا ہوں کسی روز اس مسئلے کو حل کروں گا۔ بس وقت ملنے کی بات ہے۔

ابھی ابھی میں نے چوتھی بار وقت کا لفظ کہا ہے اس لیے یہ بتانا ضروری
ہو گیا ہے کہ وقت کی اضافیت کی ایک وحشی تمثیل بھی میرے پاس تیار رکھی ہے
میری تمام چیزوں کی طرح وہ بھی خاصی گُروڈا اور انڈر نرِشڈ اور میلی میلی سی ہے
مگر کیونکہ وہ کینا کروِٹن اور کولیٹس کے مڑے تڑے پودوں سے اور مجھ سے اور ان
حرامیوں سے متعلّق ہے اور ہیٹری پام کے ڈوبتے پنجوں سے متعلّق ہے اس
لیے یہاں اس کا ذکر کرنا ازبس ضروری ہے۔

وقت کی اضافیت کی وہ وحشی تمثیل اس طرح ہے کہ:

نمبر ایک: کینا، کولیٹس اور کروٹن گزرتے ہوئے وقت میں ہیں مگر جامد کر دیے
گئے ہیں اس لیے وہ گزرے ہوئے وقت میں بھی ہیں اور مایوس ہی سہی، پر انتظار
میں ہیں اس لیے ان کا کچھ سوکھا ہوا چمڑا آنے والے وقت میں بھی ہے۔

نمبر دو: ہیٹری پام کے ضعیف پنجے گزرے ہوئے وقت میں ہیں لیکن گزرتے
ہوئے وقت میں وہ بے چارے ڈوب رہے ہیں اس لیے وہ گزرتے ہوئے وقت
میں بھی ہیں اور کیونکہ سالویشن کی اُمید لگائے بیٹھے ہیں اس لیے اُن کے پنجے آنے
والے وقت کو بھی کھرچنے جاتے ہیں۔

نمبر تین: میری رسٹ واچ گم ہو گئی ہے کہ پتا نہیں چوری کر لی گئی ہے اس
لیے میں اپنے وقت کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔

اور نمبر چار: رہے وہ حرام زادے تو ان کے بارے میں طے ہے کہ وہ ٹائم لیس ہیں۔

تمہیں شاید اندازہ ہوا ہو کہ میں نے اپنے وقت کے بارے میں بڑے ہشیار گریز سے کام لیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ بڑی چالاک تمثیل ہے۔ یہ کریہہ آوازیں بھیجنے والوں اور کہنیاں چبھونے والوں کی ڈائی لیکٹکس ہے اور میں نے انہی حرامیوں سے سیکھی ہے۔ اس طرح کے استدلال سے ہر بات ثابت کی جا سکتی ہے اور کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا۔ وقت کی اضافیت کی اس وحشی تمثیل میں میں نے ایک بات بڑی دیانتدار سے کہی ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ حرام زادے ٹائم لیس ہیں۔ مجھے معلوم ہے، میں اگر اس کی وضاحت کرنے بیٹھوں گا تو پکڑا جاؤں گا یا مارا جاؤں گا۔ اسی لیے میں ٹائم لیس کہہ کر بات ختم کر رہا ہوں۔

میں اپنے ہوش و حواس، اپنی آزادی اور اپنی جان کھونا نہیں چاہتا، ہر محتاط آدمی یہی چاہتا ہے کہ یہ چیزیں سلامت رہیں۔ اس لیے یانان، سی، حیدر کی طرح لعن طعن کرنے یا مجھ پر حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے پکڑے جانے یا مارے جانے کا کوئی شوق نہیں، میں تو یہ چاہتا ہوں کہ یہ مسئلہ حل ہو جائے (اور ایک دن ہو بھی جائے گا) بس وقت ملنے کی بات ہے۔

کھچڑی مونچھوں اور مہربان آنکھوں والے یانان، سی، حیدر کو مجھ سے اختلاف ہے۔ اس کا خیال ہے کہ وہ کمینے ٹائم لیس نہیں —— اور یہ کہ اُن کا وقت ختم ہو چکا ہے۔

یانان، سی، حیدر نے ابھی ابھی مجھ سے یہ بھی کہا ہے کہ تم نمک لگے بھینس کے سوکھے چمڑے اور ہیری پام کے ضعیف پنجوں کے درمیان کی کوئی ویجی ٹیبل ہو اور گزرتے ہوئے وقت میں مایوس کروٹن کی طرح منتظر اور مڑے تڑے کھڑے ہو تمہارے

پاس مسکین پام کے پُرامید تیقّن کی جگہ دعاؤں اور بددعاؤں کا ایک زبردست خزانہ ہے اور تم بچاؤ بچاؤ کا شور مچانے میں سب سے آگے ہو اور تمہیں یہ نہیں معلوم کہ تمہارے لیے بھی وقت بالکل نہیں ہے۔ اس بات پر اس نے اپنی ایک مہربان آنکھ سے آنسو گرایا ہے (اس کی دوسری مہربان آنکھ میں وہ سالے کہنی مار رہے ہیں)۔

وہ بڑے رسان سے کہتا ہے کہ وقت کسی کے پاس نہیں ہے۔ میں موقع مناسب جانتے ہوئے یانان سی کو وقت کی اضافیت سے متعلق اپنی وحشی تمثیل سنانا چاہتا ہوں۔ وہ مجھے روک دیتا ہے اور کہتا ہے کہ وقت کسی کے پاس نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وقت ختم ہو چلا اور تمہارے وحشی خیال کا مَلِک گھر سے بازار اور بازار سے گھر لانے لے جانے میں بہت ہی میلا ہو گیا۔ اب اسے آزاد کر دو یا اس کا تیل نکال کر اپنے بدن پر مَل لو اور کینا، کولئیس اور کروٹن کے منتظر پودوں پر مَل دو تا کہ وہ صحت مندی میں ایستادہ ہو جائیں اور ان کا مڑا تڑا انتظار ختم ہو۔ پام کے مسکین پنجوں کی پروا مت کرو۔ اُن کا ایس، او، ایس بے نتیجہ ہی رہے گا۔ وہ بیچارے اب ڈوبے کہ جب ڈوبے۔ ان کی صاف ستھری تدفین تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔

یانان سی، حیدر ٹھیک کہتا ہے۔ میرے بغیر بھی یہ مسئلہ حل ہو ہی جائے گا پھر بھی صفائی ستھرائی اچھی چیز ہے۔ میں سوچتا ہوں کسی دن میں اسے اسپرٹ سے صاف کر دوں گا اور اسے اس کا کنوارا ٹیکسچر اور ستھرا پن لوٹا دوں گا۔ ممکن ہوا تو نئے ناخن بھی لگا دوں گا۔

ایک ذلیل سائنس فکشن

میرے سب دن لنچمینٹ کے پاس ہیں۔

پہلے یوں نہیں تھا۔ کچھ ایسا یاد پڑتا ہے کہ جلاوطنی کے تیسرے میل پر انہوں نے خاردار تاروں سے ایک احاطہ کھینچ دیا تھا اور اس احاطے میں کھلے آسمان کے نیچے مجھے چھوڑ دیا تھا مگر وہ کھلا آسمان بھی نہیں تھا کیونکہ پورے احاطے پر شفّاف محدّب شیشے کی چھت پڑی تھی۔ بس سر اٹھا کر دیکھتا تھا تو محدّب شیشے کے پار سورج بہت بڑا اور آسمان بہت قریب دکھائی دیتا تھا۔ پہلے پہل میں یہی سمجھا کہ وہ مجھے بصری دھوکے میں رکھنا چاہتے ہیں شاید اسی لیے اس احاطے میں چھوڑ دیا ہے۔

میں شاید ابھی تک اسی احاطے میں ہوں —— یا ممکن ہے انہوں نے مجھے کہیں اور منتقل کر دیا ہو —— کیونکہ معلوم کرنے کے لیے دیکھنا چاہوں تو سر اٹھا کر دیکھ سکتا ہوں . . . . مگر آسمان آسمان سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ یا گرد و پیش دیکھ سکتا ہوں . . . مگر وہاں چیزیں اتنی چھوٹی ہیں کہ پہچانی نہیں جاتیں اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ پہلے میں کہاں تھا اور اب کہاں ہوں، یا یہ وہی جگہ ہے جہاں

مجھے ہونا چاہیے، یا یہ کوئی اور جگہ ہے، یا یہ کوئی جگہ ہے بھی کہ نہیں۔
پہلے پہل میں یہی سمجھا تھا کہ یہ کوئی جگہ نہیں ہے اس لیے کہ خار دار تاروں کے باہر انہوں نے دوہرے مجوف شیشوں کی چہار دیواری بنادی تھی سو ان شیشوں کے پار ہر چیز بہت چھوٹی نظر آتی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر کوئی باہر سے مجھے دیکھتا تو میں بہت چھوٹا نظر آتا۔ مگر لیتھمین کے سوا باہر سے دیکھنے والا کوئی نہیں تھا اس لیے یہ لرزہ خیز اطمینان موجود تھا کہ مجھے باہر سے دیکھنے والا کوئی نہیں ہے۔
ایک دن — کہ پتا نہیں وہ رات تھی — میں نے جب باہر کی طرف دیکھا تھا تو مجھے ہر چیز پہلے سے بھی کہیں زیادہ چھوٹی نظر آتی تھی اور میں نے گھبرا کر طے کیا تھا کہ چیزیں اتنی زیادہ چھوٹی نہیں ہوتیں اور جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں غیر منطقی ہے اس لیے اس کا وجود نہیں ہے اس لیے میں جہاں ہوں، وہ کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس پر ان کی آواز بہت ہنسی تھی اور اُس نے کہا تھا کہ یہ جگہ تو ہے، تم نہیں ہو۔
اس دن کے بعد سے — کہ پتا نہیں وہ رات تھی — میں نے چہار دیواری کے پار دیکھنا چھوڑ دیا۔ اب صرف آسمان کی طرف یا اپنے اندر دیکھنے لگا مگر اس صورت میں مشکل یہ تھی کہ چھت والے محدب شیشے کے پار اور میرے اندر مجھے ہر چیز ضرورت سے زیادہ بڑی نظر آتی تھی اور میں چونکہ چیزوں کو ان کے اصل قامت میں دیکھنا چاہتا تھا اس لیے جھنجلا گیا۔ سو میں نے محدب شیشے کے پار اور اپنے اندر دیکھنا بھی چھوڑ دیا۔ وہ یہی چاہتے تھے۔ چنانچہ اُس دن — کہ پتا نہیں وہ رات تھی — انہوں نے خوش ہو کر شیشوں اور خار دار تاروں کے دوسری طرف سے پنجے بڑھائے اور آکسیجن کا ایک ٹیوب میری طرف اُچھال دیا، اور اس کے بدلے میں میرا ایک دن اٹھا لیا۔
پہلے پہل مجھے اپنے اس ایک دن کے چھن جانے پر کوئی خاص دُکھ نہیں

ہوا۔ یہ نہیں کہ مجھے اپنے دن عزیز نہیں تھے۔ مجھے اپنے سارے ہی دن عزیز تھے۔
مگر سب سے زیادہ ضرورت مجھے آکسیجن کی تھی۔ جلاوطنی کے تیسرے میل تک جتنی آکسیجن
میں لا سکا تھا لے آیا تھا۔ اب چھت کے مُحدّب شیشے اور چہار دیواری کے مجوف
شیشوں کے ہوتے نئی آکسیجن حاصل نہیں کر سکتا تھا اس لیے اس دن — کہ پتا
نہیں وہ رات تھی — جب انہوں نے آکسیجن کا یہ ٹیوب میری طرف اُچھالا اور اس
کے بدلے میں میرا وہ دن اٹھا لیا تو میں اس اطمینان اور اس علم کی گھناؤنی دہشت
سے کانپ اٹھا کہ مجھے آکسیجن ملتی رہے گی، اور ہر بار ایک ٹیوب آکسیجن کے بدلے
وہ مجھ سے میرا ایک دن لے لیا کریں گے یہاں تک کہ کسی دن — یا ممکن ہے
وہ رات ہی ہو — میں بے دن اور بے آکسیجن ہو جاؤں گا۔

اب جبکہ مجھے آکسیجن کا ٹیوب مل گیا تھا اور میں احاطے کے وسط میں کھڑا
محدب شیشے کے گرجتے ہوئے ارتکاز کو اپنے پیروں کی طرف بڑھتا دیکھ رہا تھا
(کہ میں اب صرف جھلسی ہوئی زمین کی طرف ہی دیکھ سکتا تھا) تو مجھے بے دن
ہو جانے کی دہشت نے آن پکڑا اور جب محدب شیشے کی لیزر شعاعوں نے میری
آٹھوں انگلیوں اور دونوں انگوٹھوں کو چاٹنا شروع کر دیا اور جلتی ہوئی مٹی اور جلتے
ہوئے گوشت کی بو میری طرف بڑھنے لگی، اُس وقت میرے لیے بے آکسیجن یا بے دن
ہو جانا دونوں بے معنی ہو گئے اور میں نے پگھلتی ہوئی آٹھ انگلیوں اور پگھلتے ہوئے
دو انگوٹھوں کے اس لیزر دائرے میں قے کر دی۔

تب اچانک انہوں نے سیاہ سخت بالوں والے مہربان پنجے بڑھا کر چھت
کا زاویہ بدل دیا۔ مرتکز کرنوں کی یکساں غیر شخصی گرج بند ہو گئی اور پگھلتی ہوئی
مٹی اور پگھلتے ہوئے گوشت اور ہڈیوں نے پگھلنا موقوف کر دیا۔ میں نے اطمینان کا
سانس لیا کہ چلو ٹخنوں سے اوپر تو میں پورا ہوں۔

اور اُس دن — کہ پتہ نہیں وہ رات تھی — انہوں نے اس اطمینان کے بدلے میں میرا ایک دن اور اٹھا لیا۔

یہ پریشانی کی بات تھی مگر میں اس کا اظہار کرنا نہیں چاہتا تھا کہ کہیں وہ اسی بہانے مجھ سے میرا ایک اور دن نہ چھین لیں۔ پھر اچانک ہی یہ ہوا کہ محدب شیشے کے اذیت پہنچانے والے زاویے نے گرجتی ہوئی کرنوں کے سفیر میری پنڈلیوں پر اتار دیئے اور میں پنڈلیوں تک ختم ہو گیا۔ مجھے پنڈلیوں سے اوپر زندہ رکھنے کے جتن میں (یا ممکن ہے کوئی اور مصلحت ہو) انہوں نے اپنے سیاہ بالوں بھرے شفیق پنجے بھیج کر چھت کا زاویہ پھر سے درست کر دیا اور اس دفعہ مجھ سے کوئی اُجرت نہیں مانگی۔ میرا ایک بھی دن نہیں اُٹھایا۔ یہ بات مجھے اچھی لگی۔ سو میں نے شکر گزاری میں اپنا ایک دن اُن کے حوالے کر دیا۔

انہوں نے ایک کی جگہ دو دن اُٹھا لیے۔

میں جھنجلا گیا اور اس کے ساتھ ہی محدب شیشے کے مادر بخطا ارتکاز نے اپنی ایک مہیب گرج سے گردن سمیت میرا پورا سر اُڑا دیا۔ اور اب کے تو انہوں نے حد ہی کر دی کہ سیاہ سخت بالوں والے مسیحا پنجے بھیجنے کی بجائے انہوں نے پنجے بڑھا کر ایک ساتھ میرے کئی دن اُٹھا لیے۔ میں کیا کرتا، بس محدب شیشے کے نیچے پنڈلیوں اور شانوں تک کھڑا رہا اور جھنجلا گیا اور پگھلتا اور معدوم ہوتا گیا۔ محدب شیشے کی عذاب کرنیں بند ہونے میں نہیں آئیں اس لیے کہ جو بالوں بھرے دلنواز پنجے چھت کے شیشے کا زاویہ درست کر سکتے تھے، وہ اب تالیاں بجانے لگے تھے اور کسی طرح رُکنے ہی میں نہ آتے تھے۔ فنا کرنے والی کرنوں کے فنا کرنے والے ارتکاز نے پیڑو سے شانوں تک میرا پورا دھڑ اور پہنچوں تک میرے دونوں بازو پگھلا دیے تھے اور میں محض پنڈلیوں سے پیڑو تک تھا یا میرے دونوں پنجے۔

باقی تھے۔ ان کے علاوہ چھت کے شیشے تلے ایک ایک انچ پر لیزر شعاعیں تھیں
اور دس لاکھ بادلوں کی گرج تھی۔ میں نے خاموشی سے خود کو ان کے حوالے کر دیا تو
انہوں نے میرے سب دن اُٹھا لیے اور معدوم کرنے والی شعاعوں نے جو کچھ بچا تھا،
معدوم کر دیا۔ بس میرے دونوں خُصیے اور دونوں پنجے چھوڑ دیے۔

اور اب مجھے، کہ میرا ایک بھی دن میرے پاس نہیں، اور مجھے کہ میں صرف
خُصیے اور پنجے ہوں، مجھے یاد آ رہا ہے کہ محدّب اور مجوف شیشوں میں عذاب کے
آخری دن — کہ پتا نہیں وہ رات تھی — میں نے پہلی بار انہیں دیکھا تھا اور
ان کی تکمیل کا قائل ہوا تھا۔

وہ باہر کی کھلی فضا سے تالیاں بجاتے آئے تھے اور مجھ سے بغلگیر ہونے کو
بڑھے تھے اور میں نے دہشت کی چیخیں اور پہچان کی کلکاریاں ماری تھیں اس لیے
کہ وہ مرغزار کے پھیلاؤ میں شبنم آلود ہری ہری دوب پر لڑھکتے آ رہے تھے اور اپنے
پیچھے پگھلی ہوئی دُوب اور جھلسے ہوئے دنوں کے بدرنگ، لیس دار مادے کی لکیر چھوڑتے
جاتے تھے۔ میں نے اُن کے من موہنے گھناؤنے پن کو چھو کر دیکھا تھا اور مرغزار
کی شبنم آلود ہری دُوب پر ہری الٹیاں کی تھیں — کیونکہ وہ ہر طرح مکمّل تھے کہ اُن
کی پہچان میں گھنے سیاہ سخت بالوں والے دو مہربان پنجے تھے اور سیاہ چیچپے سمور
کی دو غلیظ گیندیں تھیں جن پر چاہت اور خوف کی نیلی وریدوں کا جال بچھا
ہوا تھا۔

اور یاد آ رہا ہے کہ میرے سب دن اُن ہی کے پاس تھے۔

اور یاد آ رہا ہے کہ میں نے شبنم آلود ہری دُوب کو پکارتے ہوئے سنا تھا اور
میں دوسرے دنوں کی تلاش میں لیس دار مادے کی بدرنگ لکیر بناتا چل پڑا تھا —
کہ پتا نہیں ابھی تک اسی احاطے میں ہوں۔

ہے للا للا

استاد عاشق علی خاں مر گیا اور بکرے کی آواز والا ایم، ایف، رحیم زندہ ہے۔
اور آنکھ مارنے والی تسُوفنی اور حقّے کی تُرتری بجانے والا آر سِہول ڈِکاسٹا اور منوّر تم
چہرے والا ہو موسیکچو تل پر دڈیوسر اور چالیس ہزار نیم مُردہ بیورو کریٹس زندہ ہیں۔
اور وہ سب جو زندہ ہیں وہ اس لیے زندہ ہیں کہ آواز کو (جو خداوند کا جمال
اور اُس کا جلال ہے اور موجودات کا حتمی توازن ہے اور نِری سچّائی ہے) اپنے
خُصیوں میں تلاش کرتے ہیں۔ اور استاد عاشق علی خاں اس لیے مر گیا کہ وہ آواز
کو اپنے وجدان میں تراشتا تھا۔ استاد عاشق علی خاں کی SENSITIVITY چلنے
والی چیز نہیں تھی، اسی لیے .... وہ مر گیا۔ وہ آواز کو خدا سمجھتا تھا اور بیالیس
ہزار راگ راگنیوں اور سُر سرتیوں کے حوالے سے اور سیہون کے شہرِ خیال
اور روشن آرا بیگم اور بڑے غلام علی خاں کے حوالے سے اور بُندو خاں کے حوالے
سے آواز کی ارسٹو کریٹک تتلیاں پیدا کرنا چاہتا تھا ـــ سو اُسے تو مرنا ہی تھا۔
اب جب کہ استاد عاشق علی خاں مر گیا ہے تو جوڈریل بنک کی رصدگاہ
نے سورج میں ایک اور اسپاٹ کی خبر دی ہے اور ایم، ایف، رحیم نے ایک

کان سے دوسرے کان تک اپنا دہانہ کھول دیا ہے اور چالیس کیمروں نے اپنے
زوم لینس اُس کے دہانے میں اتار دیے ہیں اور ان چالیس کیمروں کے پیچھے چالیس
کرومیم پلیٹیڈ بُومز ہیں جن کے سروں پر فولادی چھینکوں میں حسّاس مائکروفونز
قلمی آموں کی طرح جھُول رہے ہیں۔ یہ چالیس کیمرے ایم، ایف، رحیم کی سُوجی
ہوئی سُرخ زبان کے اختتام پر موت کے آرگزم میں اچھلتے ہوئے کلی ٹورس کو نوکس
کرتے ہیں جو وحشت اور DECAY کا مرکزہ ہے اور چالیس بُومز اُس CHAOS
کو جذب کرتے ہیں جو NONENTITY کی بڑی آنت کے نچلے سرے سے شروع
ہو کر مائیکروفونز کی فولادی جالیوں پر ختم ہوتا ہے۔

قصہ یہ ہے کہ ایم، ایف، رحیم کی پتلون، شہوت کے سنفورائزڈ دھاگوں
سے سلی ہے۔ اسی لیے تمام VTR رول کر رہے ہیں اور اسی لیے استاد عاشق علی
خاں کی ارسٹوکریٹ تتلیاں، اسٹوڈیو، بی، کی چھت سے چپکی ہوئی ہانپ رہی
ہیں اور اسی لیے اسٹوڈیو، بی، کے ربڑ لگے فرش پر ایک کرومیم پلیٹیڈ کرین
نصب ہے۔

دور کہیں گھنٹی بجتی ہے اور کرومیم پلیٹیڈ کرین کسی دہشتناک آلۂ تناسل
کی طرح اپنی JIB اٹھاتی ہے۔ کرین کی JIB پر ٹرانسلوسنٹ ساڑھی پہنے
آنکھ مارنے والی تسُوفنی کھڑی ہے۔ پھر کہیں گھنٹی بجتی ہے —— آنکھ مارنے
والی تسُوفنی پہلے اپنا پیڑو جھٹکتی ہے۔ پھر اپنی ٹرانسلوسنٹ ساڑھی جھٹکتی ہے
اور اپنا ان نشے وِن دہانہ کھول کر ساری ارسٹوکریٹ تتلیاں ہڑپ کر جاتی ہے۔

مرحبا! متورّم چہرے والا ہوموسیکچوئل پروڈیوسر، بیالیس ہزار راگ راگنیوں
اور سُر، سرتیوں کو اپنی توند سے دھکیلتا ہوا اسٹوڈیو، اے، کے دوسرے دروازوں
میں لے جاتا ہے اور سناٹے کے اس برزخ میں اپنی فلائی کا زپ کھول کر اُن پر

پیشاب کرتا ہے۔ اس آواز کی نوٹیشن F–MINOR ہے۔ مصنوعی چمڑے کا جھالردار پنڈلی بوٹ پہنے ایک چپڑقناتی لونڈا F–MINOR میں سسکاری دینے لگتا ہے۔

ایس، یو، این، سن۔ ایس، یو، این، سن۔ ایس، یو، این، سن۔

اس کی پتلون بھی شہوت کے سنفورائزڈ دھاگوں سے سلی ہے۔ وہ گرلائے ہوئے جھینگر کی طرح اسٹوڈیو دبی، کے ربڑ لگے فرش پر اچھلتا ہے اور کہتا ہے:

ایس، یو، این، سن۔

ان سب کو سورج میں جگہ بنانی ہے۔ یہ سورج کا برص آباد کرنے والے لوگ ہیں۔ یہ لافانی ہیں۔ ہر بار جب جوڈریل بنک کی رصدگاہ سورج میں کسی نئے اسپاٹ کی خبر دیتی ہے، میں سمجھ جاتا ہوں کہ استاد عاشق علی خاں مر گیا اور ایم ایف رحیم اور سسکاری دینے والے جھینگر لونڈے نے اپنے لیے سورج میں جگہ بنالی اور آنکھ مارنے والی تسکوفنی اور آرسہول ڈکاسٹا اور ہوموسیکچوئل پروڈیوسر اور چالیس ہزار نیم مردہ بیوروکریٹس کو ایک اور مہلت مل گئی۔

مگر نہیں — مجھے پوری بات کہہ دینی چاہیے۔ مجھے کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرنی۔ میں تو اس کا قائل ہوں کہ سیزر کا حق سیزر کو ملے۔

بات یہ ہے کہ انہوں نے، جو زندہ ہیں اور سورج میں لافانی ہیں، انہوں نے استاد عاشق علی خاں کو زندہ رہنے کی ایک مہلت دی تھی اور اسے راگ ایمن کلیان میں ایک JINGLE کمپوز کرنے کو کہا تھا۔ یہ JINGLE ان کے نئے ایف ایل کی توصیف میں تھا۔ اس میں ۲۷ بار، نشیلی، رسیلی، کٹیلی، لچکیلی اور پھسلیلی کے الفاظ آتے تھے اور یہ بتایا گیا تھا کہ نیا ایف ایل ELECTRONICALLY TESTED ہے طاقت سے بھرپور اور دنیا بھر میں مشہور ہے اور اس کے استعمال کے بڑے اجر ہیں۔ اور یہ سب باتیں راگ ایمن کلیان میں کہی جانی

تھیں جو خداوند کی حمد کا راگ ہے اور ڈھائی ہزار برس کے انسانی وجدان میں آواز کا معجزہ ہے۔

اور یہ ساری باتیں حقّے جیسی ترتری کے LUBRICATED نوٹس پر لکھی جاتی تھیں اور ان باتوں کے لیے بالالتزام کانگو، بونگو اور "آجاؤ افریقہ" والے ڈھول فراہم کیے گئے تھے اور ایک الیکٹرک ستار بھی تھا اور اسپینش اور بَیس گٹاریں اور چیلو اور مراکش اور اسکریپر تھے اور مُرلی دھر کی فلیوٹ تھی اور سارنگیاں اور سرود تھے۔ اور وائلین اور وینا اور مردنگ تھے اور ایک تجویز یہ تھی کہ انٹرلیوڈ میں دم توڑتے ہوئے استاد عاشق علی خاں کی آکار بھی ڈال دی جائے۔

تاہم یہ محض ایک تجویز تھی اور اس سے اتفاق کرنا نہ کرنا استاد عاشق علی خاں پر موقوف تھا۔

تو انہوں نے، جو سورج میں لافانی تھے اور استاد عاشق علی خاں کو زندگی کی مہلت دینے آئے تھے — انہوں نے جب یہ ساری باتیں کہہ ڈالیں تو استاد عاشق علی خاں نے ہاتھ باندھ کر اُن سے چلے جانے کو کہا اور ناشکرگزاری میں خون کی الٹیاں کیں۔ سو جو زندگی دینے آئے تھے — وہ چلے گئے مگر انہوں نے استاد عاشق علی خاں کو معاف نہیں کیا۔ انہوں نے اس کی ڈیوڑھی میں نہ ختم ہونے والے اندھیرے کا غبار چھوڑ دیا اور پان کی پیک بچھا دی اور پیشاب کی بو ٹانک دی اور لکڑی کے چکّر دار زینے پر ٹراموں کے گھنٹے لٹکا دیے اور عورتوں کی دلالی کرنے والے لڑکوں کے آوازے سجا دیے اور اسٹوڈیوں کی ہاہاکار لکھ دی اور ایک ایک سیڑھی پر چالیس چالیس ٹریفک کانسٹیبل کھڑے کر دیے، جو عقوبت کے ٹریفک جام میں پیتل کی DISCORDANT سیٹیوں سے آوازوں کے برسٹ مارتے تھے۔

اور بکرے کی آواز والے ایم، ایف، رحیم نے یوں کیا کہ وہ چڑیا گھر سے ہارمونیکا بجانے والا ہاتھی پکڑ لایا اور ہارمونیکا بجانے والے ہاتھی پر کھڑے ہو کر لوہے کے سریے سے ٹین کے کنستر پیٹنے لگا۔ پھر اُس نے استاد عاشق علی خاں کی کھڑکی کے مقابل ہاتھی کے مستک پر کھڑے کھڑے گوز صادر کیا اور کوئلے سے مکان کی دیوار پر "ہے للا للا" لکھ دیا۔

تو یہ تھی وہ کہانی جو میں نے خود ہی گھڑ لی ہے۔

اس لیے کہ میں نے استاد عاشق علی خاں کو مرتے ہُوئے نہیں دیکھا اور ایم ایف، رحیم کو ٹین بجاتے نہیں سنا اور آنکھ مارنے والی نسُوفتیٰ اسٹرپ ٹیز نہیں دیکھا اور آر سہول ڈِ کاسٹا کو تُرتُری پر اِستمنا بالید کرتے نہیں سُنا اور متورم چہرے والے ہومو سیکچوئل کا F—MINOR نہیں دیکھا اور جھینگر لونڈے کو جھالر بوٹ پہن کر سورج میں چہل قدمی کرتے نہیں دیکھا۔

میں سماعت اور بصارت کے ایک دہشت ناک تناظر میں بہرا اور اندھا پیدا ہُوا ہوں۔

سُوروں کے حق میں ایک کہانی

بہت بلندی سے ایک پہاڑی اترتی ہے۔

جس طرح مسجد جامع کی دُھلی دُھلائی سیڑھیاں متانت کے ساتھ قاضیٔ شہر کے پاپوش چومتی ہوئی نیچے، عامۃ النّاس کی دھواں لپٹی دنیا میں اتر رہی ہوں۔

ٹھیک اسی طرح ایک پہاڑی اُترتی ہے۔

تو شام کے جھٹپٹے میں اور کبھی دُھند میں شاید کئی لاکھ فیٹ کی بلندی سے ایک پہاڑی، کبھی ہلکے کبھی گہرے بادلوں والے آسمان سے ساون کی دو تین سو رنیر جھروں کی انگلی تھامے قدم قدم اُترتی ہے اور تال کے کنارے تک جا پہنچتی ہے اور ساون کا یہ جلوس باوَن گنگا کہلاتا ہے۔ اور جو گنتی کرنے بیٹھو تو اِن گنگاؤں کی تعداد باوَن نہیں رہتی، دو تین سو سے اوپر پہنچ جاتی ہے مگر ساون میں گن کون سکتا ہے۔ یہ تو بے حسابی کی رُت ہے۔

تو یہ کئی سو گنگائیں نیچے پہنچ کر ایک بارہ ماسی تال بناتی ہیں جس کی سطح سنگھاڑے کی بیلوں سے اور جل کُمبھی سے اور تین قسم کے کنول سے ڈھکی رہتی

ہے۔ تال میں بہت سے چھوٹے چھوٹے ٹاپو ہیں جو آدمی کے قد جتنی اُونچی، گہرے ہرے رنگ کی چکنے تکونے ڈنٹھل والی آبی گھاس پہنے رہتے ہیں۔ اس گھاس کے ڈنٹھل اس قدر چکنے، اتنے آبدار اور لچکدار ہیں کہ لگتا ہے اندرونی آرائش کرنے والوں کی سہولت کے خیال سے انہیں ٹھوس نائیلون سے بنایا گیا ہے اور یہ کوئی بہت پائیدار، واشبل قسم کی آرائشی چیز ہے۔ کبھی لگتا ہے کہ یہ ڈنٹھل کسی سخت گیر اسکول ماسٹر کی لہراتی ہوئی چھڑیاں ہیں جن کے سروں پر ماسٹر نے سجاوٹ کے لیے چار چار پانچ پانچ شاخوں والے طرّے لگا رکھے ہیں۔ ان شاخوں سے پور پور برابر کی پتلی لوزینجیز کی شکل کی سخت ہری پتیاں چپکی ہوتی ہیں، جیسے کنکھجورے کے بدن سے اس کی ہزاروں بے چین ٹانگیں چپکی ہوں۔ اور جس وقت یہ آبی گھاس بھیگی ہوئی ہوا کے ساتھ لہرا رہی ہوتی ہے تو بے خیالی میں، یادیں، اس کی تمام لہروں کے خطوطِ حرکت کو خود پر نقش کر لیتی ہیں اور پتا بھی نہیں چلتا اور تیس چالیس برس گزر جاتے ہیں پھر اچانک ایک ایک لہر اقلیدسی اشکال میں خود کو دہراتی ہوئی آتی ہے اور آنکھوں کی پتلیوں کے پیچھے بجلیاں سی کوندنے لگتی ہیں۔

تو یہ سارے ٹاپو اس آبی گھاس سے پٹے پڑے ہیں اور یہ آبی گھاس کبھی پیلی نہیں پڑتی، سدا ہری بھری رہتی ہے۔ اس لیے کہ ساون رہے نہ رہے تال کے اس دور دراز حصّے میں کمر کمر پانی تو سارے سال ہی رہنا ہے۔ پھر یہ ہری ہری پتّیاں اور ہرے ڈنٹھل کاہے کو پیلے پڑنے لگے۔ سارے سارے سال ٹاپوؤں کے یہ ماسٹر سڑک پر چلنے والے اِکّا دُکّا مسافر کو چھڑیاں لہرا لہرا کر دھمکاتے رہتے ہیں کہ گھن گرج کے ساتھ دوبارہ ساون آ جاتا ہے۔ ساون میں یہ ٹاپو ایک دم گھونٹ دینے والی تیز سبز بُو اچھالتے ہیں جو مچھلیوں کے جیتے جیتے

سُرخ گلپھڑوں سے گزرتی ہوئی ساری دنیا میں پھیل جاتی ہے اور قریب کے رہگیروں کو ڈُب میں بیٹھے ہُوئے شریر بچّوں کی طرح، شرابور کر دیتی ہے۔

شام گہری ہوتے اِدھر سے کم ہی لوگ گزرتے ہیں۔ وہ شاید گہرے ہرے رنگ کے اس اندھیرے سے ہول کھاتے ہوں گے یا شاید وہ اپنی یادوں کو زیادہ تُند و تیز چیزوں سے بھرنا نہیں چاہتے —— وہ ہلکے پھلکے رہتے ہُوئے جینا چاہتے ہیں —— مگر کیا ہلکے پھلکے رہتے ہوئے جینا ممکن ہے؟

میں نے تال کنارے ایک اُجڑی ہوئی امرائی کو بھرپور ساون میں بھی سب قِصّوں، قضیوں سب چیزوں سے الگ تھلگ پڑے دیکھا ہے اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہلکے پھلکے رہتے ہُوئے جینا کیسے ممکن ہے۔ یہ امرائی، تال میں اور تال کے آس پاس اور پہاڑی پر جو کچھ ہو رہا ہے اُس سے الگ تھلگ اور اس کے بیچوں بیچ موجود ہے اور دھیرے دھیرے مرتی جا رہی ہے۔ یوں ہے کہ تال کے بائیں کنارے سے جو ایک چھوٹی سی مسکین پہاڑی اُٹھتی ہے اور بادن گنگاؤں والی پہاڑی کی دوسراتھ کے خیال سے کچھ دور چلتی ہوئی پھر ہموار سطحِ مُرتفع میں گم ہو جاتی ہے (جیسے بیاہ میں آئے ہُوئے بڑوسی دُعا سلام کے بعد رشتے ناتے والوں سے ذرا ہٹ کر ایک طرف کو جا بیٹھیں) تو اسی پہاڑی کی گود میں یہ چھوٹی سی امرائی پڑی ہے اور یہ دھیرے دھیرے مَرتی جا رہی ہے۔ سو دو سو برس پہلے یہاں آم کے بے گنتی پیڑوں پر بے حساب توتے اور کوئلیں اکٹھا ہوتے اور پُکار کرتے تھے۔ اب سناٹا رہتا ہے۔ گنتی کے دس بیس بوڑھے گنجے درخت بکریوں کے ریوڑ سنبھالے بظاہر سکون سے کھڑے رہتے ہیں۔ جہاں اب بینگنیوں کی بچھات بچھی ہے کبھی مست مہک والے آموں کا بُور فرش کیے رہتا تھا اور درختوں تلے اُگی ہوئی کمزور ہری

گھاس پر چمکیلے دھاری دار گاؤن پہنے گلہریاں دوڑ لگاتی تھیں، بھورے کوٹ والے لنگور اُدھم کرتے تھے اور چالاک گرگٹ پل پل میں لباس بدلتے تھے۔ یہ سب اب اُوپر چلے گئے ہیں کہ اوپر اب بھی سیتا پھلوں کے ٹیڑھے میڑھے درختوں کے بیچ میٹھے کرونددوں اور اچاروں کی جھاڑیاں ہیں اور تیز بسنتی رنگ میں رنگے ہوئے شہد بھرے قمقموں کے جھابے اٹھائے تیندو کے درخت کھڑے ہیں اور بیل کے تناور پیڑ ہیں جو میٹھی مٹی کے میٹھے پھلوں کے درمیان سنتریوں کی طرح اپنی موجودگی کا یقین دلاتے ہوئے چھوٹی پہاڑی پر چڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اور پھولوں میں املتاس ہے اور ٹیسو ہے اور گیندے کی جھاڑیاں ہیں اور اس چھوٹی پہاڑی پر بکھرے ہوئے سالہاسال کی دھوپ کھائے، کروڑوں برساتیں جھیلے ٹیڑھے ترچھے پتھروں کو سر کا سر کا کر قیمتی ایلُو ویَل مٹی نے پیوند لگا دیئے ہیں جہاں کسی بھی وقت کچھ بھی اُگنے لگتا ہے۔ جہاں جہاں مٹی کا جِس کمزور پڑ جاتا ہے وہاں بُھربُھری مٹی میں خرگوشوں کے قبیلے سرنگیں کھود لیتے ہیں اور سیہہ کا اِکا دُکا خاندان اپنا بھٹ بنا لیتا ہے اور رات گئے اپنی سیلولائڈ کی کانٹوں دار زرہ بکتریں پہن کر گھومنے نکلتا ہے تو اپنے نشانات چھوڑ جاتا ہے پھر سطحِ مرتفع پر بنے ہوئے گھروں سے بھیگی ہوئی ہوا میں سُوں سُوں کرتے ہوئے بہت سے بچّے اُترتے ہیں اور یہ سیلولائڈ کی قلمیں اکٹھی کرتے ہیں اور انہیں اپنے دفتی کے ڈبّوں میں سنبھال کر رکھ دیتے ہیں کہ تیس چالیس برس بعد وہ انہیں اپنی پلکوں سے چنیں گے اور تیس چالیس برس پرانی بھیگی ہوئی ہوا میں سُوں سُوں کریں گے۔

اور سیاہ ایلُو ویَل مٹی کے پیوندوں میں گومچی کے نیم قد درخت بیٹھے اپنی مالاؤں کے سیاہ و سرخ ناسفتہ منکے بکھیرتے رہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس

نیز ہرے گردو پیش میں اُن کا لایا ہُوا سرخ اور ان کا لایا ہُوا سیاہ بھی چمکتا ہے۔
تو بے شمار چمکیلے رنگوں کا یہ طوفان چھوٹی مسکین پہاڑی پر آیا ہُوا ہے جس کی گود میں سب سے بے تعلق یہ مرتی ہوئی اَمرائی پڑی ہے اور چھوٹی مسکین پہاڑی باون گنگاؤں والی وشال پہاڑی کی بازگشت ہے کہ اس کے پہلو سے آکار کھنچی ہوئی اُٹھی ہے اور اس آکار کو گلہریاں اور لنگور اور گرگٹ اور خرگوشوں کے قبیلے اور سیہہ کا اِکّا دُکّا خاندان اور بھیگی ہُوئی ہوائیں سُوں سُوں کرتے ہوئے بچتے ہی سُن سکتے ہیں۔اور باون گنگاؤں والی پہاڑی ملہار ہے۔ اور میگھراج کے پُرشور رتھ میں جُتے ہوئے گھوڑوں کی گردنوں کو چومتا ہوا جب دامنی کا کوڑا لشکتا ہے تو یہی وشال پہاڑی اک بھینکر روپی راگنی ہے جسے رونگٹے کھڑے کر دینے والی وحشی مسرت کے ساتھ تال کے کمر کمر پانی میں کھڑا ہوا یہ آدمی سُن رہا ہے۔
یہ سُنتا جاتا ہے کہ اس کی بند آنکھوں کی پتلیوں کے پیچھے سمرتیوں کی بجلیاں کوند رہی ہیں۔
تو اس آدمی کو ہاتھ پکڑ کر ٹاپوؤں کی سنگت سے اور سنگھاڑے کی بیلوں اور جل کمبھی کی سنگت سے اور تین قسم کنول کی سنگت سے کھینچ لو کہ سننے والوں اور سُورَوں کے درمیان تم اپنا فیصلہ سنا چکے۔سو اسے ہاتھ پکڑ کر کھینچ لو) اور اس دوسرے کو، اُس سُوَر کے تخم کو لے آؤ جو ناک پر رومال رکھے امرائی میں دُبکا بیٹھا ہے۔یہ دوسرا، اپنے بُل ڈوزر اور اَرتھ موور اور کلہاڑے اور چھینیاں لے کر آئے گا اور تین سو نبر جھرنوں کو روک دے گا، ایک نقلی آبشار بنائے گا اور تال کنارے ٹاپوؤں کی ہری ہری گھاس کھینچ کر وہاں سیمنٹ کے بلاک جڑ دے گا — اور کرائے کے موٹر بوٹ چلائے گا پھر سنگھاڑے کی بیلوں

پر اور جل کمبھی پر اور نتین قسم کے کنول پر سگریٹوں کے بٹ کاغذ کے گندے
رومال اور استعمال شدہ ربر پھینکے جائیں گے اور چھوٹی مسکین پہاڑی پر چوہے
سے نقشے بننا شروع ہوں گے اور گلہریاں اور لنگور اور رنگین لباسوں والے
گرگٹ اور روئی کے ڈھنکے ہوئے خرگوش اور سیہہ اور سُوں سُوں کرتے ہوئے
سب بچّے پہاڑی سے چلے جائیں گے اور چمکیلے رنگوں والی پہاڑی کی آکار
ڈوب جائے گی — بس فلش ٹینکوں کی غرّاہٹیں رہ جائیں گی — کہ ٹرمپیٹ
کی آخری سانسوں تک سنی جا سکیں گی۔

میں اور میرے لوگ

✤ وسطِ ہند کی پٹھان ریاست بھوپال میں میرزا اسدُاللہ خاں غالبؔ کے ایک شاگرد تھے، نواب یار محمّد خاں رفعتؔ۔ اُن کے منجھلے صاحب زادے سردار سُلطان محمّد خاں سُلطاںؔ کی بیٹی منوّر جہاں بیگم میری ماں تھیں۔

✤ میرا قبیلہ آفریدی، میرزائی خیل۔ متوطن تیراہ (مضافِ درّۂ خیبر)

✤ بانیٔ ریاست بھوپال، صاحب السّیف سردار دوست محمّد خاں بہادر نویں 9 پیڑھی میں میرے جَد ہیں۔ یہ سن سترہ سو تین عیسوی میں واردِ ہندوستان ہوئے۔ (میں نے دو سو سینتالیس برس بعد وہ ملک چھوڑ دیا۔)

✤ میرے دادا، میاں کمال محمّد خاں — کسان، پیرِ شریعت، جاگیر دار[1]۔

✤ میرے باپ، میاں عزّت محمّد خاں — مصوّری کے اُستاد، شانتی نکیتن کے ڈراپ[2] آؤٹ جنھوں نے عمر کے آخری تیس برس گاؤں گاؤں تبلیغِ دین کے لیے نکلنے میں صرف کیے۔

---

[1] جاگیر نوجوانی میں ہی چھنوا بیٹھے تھے کہ خاصے مصلحت نااندیش اور مغلوبُ الغضب بزرگ تھے، عُلیا حضرت والیۂ ریاست کی خفگی مول لیتے پھرتے تھے۔

[2] چند ماہ بعد ہی میرے دادا کا حکم موصول ہوا تھا کہ — فوراً گھر پہنچو، بدعقیدہ لوگوں کی ہمہ وقت کی صُحبت تمہارے حق میں چنداں مناسب نہیں۔ دادا نے یہ خط اپنے بچپن کے دوست ٹھاکر صاحب جگنپورہ کی تحریک پر لکھا تھا جو خود کٹّر ہندو تھے اور ٹیگور کے مِسٹی سزم کو ہندو "چرچ" سے انحراف کا شاخسانہ سمجھتے تھے۔

- میرے خاندان میں پینسٹھ کلرک، چودہ والیانِ ریاست اور نواب، دو ڈکیت، تین نیتا، گیارہ جرنیل، ایک صاحبِ کرامت[3] ولی، ایک شہید[4]، چھ ٹوڈی، دو کامریڈ، ایک اولمپئن، سات مکینک، چونتیس تحصیلدار، ایک مؤذّن، دو ڈپلومیٹ، سات شاعر، پانچ ناک کے دار، کچھ پولیس والے، بہت سے لکچرار اور اُستاد، ایک تانگے والا، تیس چالیس جاگیردار اور پانچ سونگھنے پیدا ہوئے۔
- میرے ایک پَردادا نے ایک پرنانا کو محض اس لیے تلوار مار کر ہلاک کر دیا تھا کہ دعوتِ ولیمہ کی کسی فرشی نشست میں جوتیاں اتارتے ہوئے غلطی سے اِن صاحب کی جوتی پر اُن صاحب کی جوتی چڑھ گئی تھی۔
- میرے خاندان میں آج تک خودکشی کی واردات نہیں ہوئی۔

(ہم لوگ زندگی سے چمٹے رہنا جانتے ہیں)

- میں بھوپال کے آبائی مکان میں ۶ ستمبر ۱۹۳۲ء کو رات میں کسی وقت[5] پیدا ہوا تھا۔ شاہجہانی ماڈل ہائی اسکول بھوپال، حمیدیہ کالج بھوپال، جے جے اسکول آف آرٹ بمبئی، ریلوے والٹن ٹریننگ اسکول لاہور، جناح کالج کراچی،

---

[3] صاحبِ کرامت، فیض الدولہ بہادر نواب فیض محمد خاں فتح جنگ پیش گاہِ شاہی (المعروف بہ فیض بہادر اولیاء نور اللہ مرقدہٗ) کہ جن کا مزار آج بھی مرجعِ خلائق ہے۔

[4] شہید عثمان محمد خاں خاکسار تھے بھوپال سے آکر لاہور میں انگریزی کی گولی سے شہید ہوئے۔ انہوں نے بیلچے سے لڑتے ہوئے جان دے کر، میرے حسابوں اُس گناہ کا کفارہ ادا کر دیا جو بھوپال سے ۱۸۵۷ء میں سرزد ہوا تھا۔ بھوپال میں نئے قلعے کے صدر دروازے پر ایک یادگاری تختی لگی تھی جس پر انگریز سرکار کی طرف سے تصدیق کی گئی تھی کہ بھوپال وفادار ہے اس نے پچاس سپاہیوں سے مدد دے کر بغاوت کو کچلنے میں ہاتھ بٹایا ہے۔ میں نے گیارہ برس کے بے بس غصے میں تختی پر کیچڑ مل کر ذلّت کا یہ داغ چھپانا چاہا تھا۔ میرے ماموں زاد نے اُنیس برس کی عمر میں اپنے خون سے یہ داغ دھو دیا۔

[5] دادا نے اپنی بیاض میں اس پیدائش کا اندراج یوں کیا ہے: "ساعتِ نحس میں تولّد ہوا۔ اللہ پاک اپنا کرم فرمائے۔"

سندھ مسلم آرٹس کالج کراچی، اردو لا کالج کراچی اور یونیورسٹی آف کراچی (شعبۂ انگریزی) وہ ادارے ہیں جنہوں نے مجھے کچھ نہ کچھ بنانے کی کوشش کی اور ناکام رہے۔

- میں نے کمرشیل آرٹسٹ، پبلشر، کلرک، اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر، ٹریول ایجنٹ، انگریزی کا استاد، کمرشیل رائٹر، ریڈیو نیوز ریڈر...... ایسے بہت سے کام کیے اور ٹھیک سے کچھ بھی نہیں کیا۔
- میں بال بچّوں والا آدمی ہوں۔
- میں گیت، نظمیں، کہانیاں، ناٹک، ایک فلم، ایک ناول اور ایک وصیّت نامہ لکھنا چاہتا ہوں اور اپنے باپ کی طرح تصویریں بنانا چاہتا ہوں۔

(میں زندگی سے — آکٹوپس کی طرح — آٹھ حوالوں کے ساتھ چمٹے رہنا چاہتا ہوں)

کھڑکی سے جس قدر آسمان تم کو نظر آتا ہے وہ تمہارا ہے
اور جس قدر آسمان مجھ کو نظر آتا ہے وہ میرا ہے

کھڑکی سے جس قدر آسمان تم کو نظر آتا ہے وہ تمہارا ہے
اور جس قدر آسمان مجھ کو نظر آتا ہے وہ میرا ہے
کھڑکی سے جس قدر آسمان تم کو نظر آتا ہے وہ تمہارا ہے
اور جس قدر آسمان مجھ کو نظر آتا ہے وہ میرا ہے
کھڑکی سے جس قدر آسمان تم کو نظر آتا ہے وہ تمہارا ہے
اور جس قدر آسمان مجھ کو نظر آتا ہے وہ میرا ہے
کھڑکی سے جس قدر آسمان تم کو نظر آتا ہے وہ تمہارا ہے
اور جس قدر آسمان مجھ کو نظر آتا ہے وہ میرا ہے
کھڑکی سے جس قدر آسمان تم کو نظر آتا ہے وہ تمہارا ہے
اور جس قدر آسمان مجھ کو نظر آتا ہے وہ میرا ہے
کھڑکی سے جس قدر آسمان تم کو نظر آتا ہے وہ تمہارا ہے
اور جس قدر آسمان مجھ کو نظر آتا ہے وہ میرا ہے
کھڑکی سے جس قدر آسمان تم کو نظر آتا ہے وہ تمہارا ہے
اور جس قدر آسمان مجھ کو نظر آتا ہے وہ میرا ہے
کھڑکی سے جس قدر آسمان تم کو نظر آتا ہے وہ تمہارا ہے
اور جس قدر آسمان مجھ کو نظر آتا ہے وہ میرا ہے
کھڑکی سے جس قدر آسمان تم کو نظر آتا ہے وہ تمہارا ہے
اور جس قدر آسمان مجھ کو نظر آتا ہے وہ میرا ہے
کھڑکی سے جس قدر آسمان تم کو نظر آتا ہے وہ تمہارا ہے
اور جس قدر آسمان مجھ کو نظر آتا ہے وہ میرا ہے
کھڑکی سے جس قدر آسمان تم کو نظر آتا ہے وہ تمہارا ہے
اور جس قدر آسمان مجھ کو نظر آتا ہے وہ میرا ہے
کھڑکی سے جس قدر آسمان تم کو نظر آتا ہے وہ تمہارا ہے
اور جس قدر آسمان مجھ کو نظر آتا ہے وہ میرا ہے
کھڑکی سے جس قدر آسمان تم کو نظر آتا ہے وہ تمہارا ہے
اور جس قدر آسمان مجھ کو نظر آتا ہے وہ میرا ہے
کھڑکی سے جس قدر آسمان تم کو نظر آتا ہے وہ تم